مجالس خطیب الامت

مؤلف

مولانا عبدالسلام ابراہیم مارویالاجپوری (لندن)

ناشر

مکتبہ ابراہیم اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت

کتاب کا نام	:	مجالس خطیب الامت
مؤلف کا نام	:	مولانا عبد السلام ابراہیم مارویا لاجپوری (مقیم لندن)
کمپوزنگ	:	(قاری) عبد الرحمٰن بھڑکودروی (0091-9924661786)
ناشر	:	مکتبہ ابراہیم اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت
مطبع	:	سُپر تاج، سورت
ایڈیشن	:	پہلا ایڈیشن
سن طباعت	:	۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۱ء
صفحات	:	۲۱۸
تعداد	:	۱۰۰۰

(۱) مکتبہ ابراہیم اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت۔

(۲) مدرسہ اسلامیہ صوفی باغ، سورت۔

(۳) A.SALAM MARVIA 23 FLAT B SPRING FILED GARDENS LONDON E59ER. PH: 02088061051

فہرست مضامین

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

چند تاثرات

محترم ناظرینِ کرام، میرے عزیزِ مکرم جناب حافظ قاری مولانا عبد السلام زادمجدہ نے اپنی مرتب کردہ دس مجالس خطیب الامت حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ، نظرِ ثانی کے لیے ارسال فرمائیں، اوراس کے ساتھ اپنے کچھ تاثرات بھی تحریر کرنے کا حکم دیا، یہ مجالس عارف باللہ حضرت العلامہ مولانا سید ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ (شیخ الحدیث فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات ہند) کی ہیں، مرحوم مولانا سید ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ ایک عظیم روحانی شخصیت اور اکابرِ علمائے دیوبند بالخصوص مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی رحمہ اللہ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کے علمی اور روحانی عظمتوں کے امین اور ترجمان تھے۔

حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کی پوری زندگی قرآن مجید کی تفسیر اور احادیثِ رسول ﷺ کے درس وتدریس میں گذری، اوراس کے ساتھ ساتھ وعظ وتقریر کے میدان میں شروع سے آخر تک عوام وخواص میں ایک کامیاب اور مقبول مقرر اور واعظ رہے۔آپ کی باتیں بہت ہی پر مغز اور قیمتی ہوتی تھیں اور عوام وخواص پر زبردست اثر ہوتا تھا، آپ ہمیشہ اصاغر واکابر علماء و مشائخ کے معتمد اور سلوک وطریقت کے طالبین کے مرجع رہے۔

پیشِ نظر ''مجالسِ خطیب الامت'' آپ کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ایک زریں کڑی ہے، اگرچہ مختصر ہے، تاہم اپنے مضامین اور وقیع ملفوظات و بیانات کی وجہ سے ایک قابلِ قدر علمی تحفہ اور ایک حیات آفریں پیغام ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ کے ایک مخلص

ومقبول بندے کی اصلاح وتربیت اور غمخواریٔ امت کی روئیداد کی ایک مختصر، مگر روشن جھلک سامنے آئے گی، اس مختصر کتابچہ کو ''کشکولِ معرفت'' کہئے یا ''مجالس خطیب الامت'' یہ ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کا مصداق ہے۔

بلاشبہ اولیاء کی صحبت کو مولانا روم رحمہ اللہ نے صد سالہ طاعتِ بے ریا سے بہتر قرار دیا ہے۔ علماء وعارفین کی محفل میں بیٹھنے کو زندگی کا حسن کہا گیا، اس کی وجہ بندۂ ناقص کے خیال میں یہی ہے کہ وہ اپنے سالہا سال کے مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ اپنے ہم نشینوں کی محنت اور مشقت کو کم کر دیتے ہیں، یہ بالکل اس طرح ہے جس طرح ایک شخص اَنار کا پودا اُگاتا ہے، اسے تمام مشکل مراحل سے گذار کر جب پھل پک کر تیار ہو جاتا ہے تو اس کا رس نکال کر اپنے مہمانوں کو پیش کرتا ہے، لینے والوں نے صرف اتنی زحمت گوارا کی کہ لبوں پر رکھ کر حلق سے اتار دیا، بلاشبہ صلحائے امت، اولیاء اللہ اور مشائخ کی مجالس اور ان کی صحبتیں، ان کے ارشادات، ان کی دلنواز نگاہیں اور توجہات نسخۂ اکسیر ثابت ہوتی ہیں، اور انسان کی زندگی میں روحانی انقلاب آجاتا ہے، وہ اپنے مقصدِ حیات کو پالیتا ہے، اس کے اندر اپنے خالق و مالک کی معرفت، عشق اور محبت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ رسول اللہ ﷺ کا عاشق اور سنتوں کا شیدائی ہو جاتا ہے۔

نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ان مجالس کا کوئی مستقل متعین موضوع یا کسی خاص مضمون کا کوئی مستقل درس نہیں ہوتا، بلکہ حاضرینِ مجلس کی طرف سے کوئی سوال پیش کیا گیا تو اس کا جواب، یا پھر حسبِ حال اللہ تعالیٰ اپنے مصلح بندے کے قلب میں جو باتیں ڈال دیتے ہیں وہ باتیں ارشاد کردی جاتی ہیں۔ اس طریقے سے ان مجالس میں قرآن وحدیث کے جواہر پارے، رشد و ہدایت کے اقوال، سلوک وتصوف کے نکات، اصلاحی علمی تحقیقات، سلفِ صالحین اور

بزرگوں کے حالات و واقعات آ جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ گفتگو بڑے گہرے معارف وحقائق، دقیق نکات حیرت انگیز علمی و روحانی لطائف پر مشتمل ہوتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ وغیرہ اکابر علماء کی مجالس اور ملفوظات اس کے شاہدِ عدل ہیں۔

حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت ہی عمیق علم اور سلوک وطریقت میں بہت ہی اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ موصوف ایک ایسے مصلح اور مشفق داعی تھے کہ آپ کا مقصدِ زندگی علمِ دین کی خدمت اصلاحِ امت کی فکر اور دعوت تھی۔ آپ کی نظر ''لینے'' سے زیادہ ''دینے'' اور ''فائدہ اٹھانے'' سے زیادہ ''فائدہ پہنچانے'' پر تھی۔ غضب کا استغناء اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، آپ کے ملفوظات میں نادر علمی تحقیقات بلند و بالا لطائف کا ایسا ذخیرہ ہوتا ہے کہ انسان کو بہت سی حقائق و معارف کی باتیں ضخیم کتابوں کے بعد بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ اور بعض اوقات ایسے دقیق مضامین ہوتے ہیں، جن کو سمجھنا بھی ہم جیسوں کے لیے دشوار ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے موصوف کو ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ عام فہم آسان مثالوں سے دقیق مضامین سمجھا دیتے تھے اور اس پر مزید یہ کہ دورانِ گفتگو مزاحیہ لطیفے، دل کو چھوتے ہوئے قدیم و جدید شعراء کے اشعار پیش فرماتے تھے، جس سے مجلس میں فرحت وانبساط کی لہر دوڑ جاتی تھی۔

بہرحال! حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کی مجلس بڑی پر رونق ہوتی تھی، حاضرین آپ کے کلام پر انوار کو بڑے شوق سے سنتے، آپ کی مجالس اور بیان کی برکت سے نہ معلوم کتنے لوگوں نے اصلاح کی ہوگی، کتنے لوگوں نے اپنے دل پر سے غفلت کے پردے ہٹائے ہوں گے اور اپنی روح کو تازگی بخشی ہوگی اور ان کے اندر آخرت کی فکر پیدا ہوئی ہوگی۔ یہ باتیں ناکارہ صرف اپنی عقیدت مندی کی بنیاد پر نہیں

کہہ رہا ہے، آپ بھی جب ان مجالس کا مطالعہ کریں گے تو انشاء اللہ آپ کے تأثرات بھی یہی ہوں گے۔

میرے عزیز مولانا عبد السلام سلمہٗ مبارک بادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے افادۂ عام کی غرض سے بڑی محنت سے ان قیمتی جواہرات کو کیسیٹوں سے نقل کر کے ان مجالس کو مرتب کیا، جس کی برکت سے وہ حضرات جو ان مجالس میں شریک نہیں تھے وہ بھی انشاء اللہ ان سے مستفید ہوسکیں گے۔

ملفوظات کی ترتیب بھی اس سلیقہ سے کی گئی ہے کہ ملفوظات کو موضوع کے لحاظ سے الگ الگ کر دیا گیا ہے اور ملفوظات پر عنوانات بھی لگا دیئے گئے ہیں اور عنوان بھی دلچسپ ہیں، اور کہیں کہیں مرتب نے مفید اور مختصر اضافے بھی کئے ہیں اور وہ زیادہ تر حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کے ''فیضِ ابرار'' ہی سے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرتب کو اور ان کے معاونین کو اپنے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان مجالس کو اللہ تعالیٰ قبول اور نافع بنائیں اور اللہ تعالیٰ قدر دان کے ہاتھوں میں پہنچائیں، اور مرتب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائیں اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائیں۔ آمین

حقیقت میں مولانا عبد السلام اس شعر کے مصداق ہیں:

ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا	☆	اب جس کے جی آئے وہی پائے روشنی
میرے خلوص کا کیا بدلہ دوگے	☆	تمہاری بزم میں آبِ حیات لایا ہوں

فقط والسلام

(حضرت مولانا) منور حسین سورتی (دامت برکاتہم)

امام بالہم مسجد لندن

۹ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ بمطابق ۱۲ فروری ۲۰۱۱ء

پیش لفظ

محترم قارئین، شیخ الحدیث حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ کو اللہ پاک نے دینی علوم میں بڑا رسوخ عطا فرمایا تھا۔ حضرت رحمہ اللہ جہاں ایک کامیاب مدرس تھے وہیں ایک بہترین خطیب بھی تھے، اس لیے حضرت کا افادہ مدارس کے طلبہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، بلکہ عام لوگوں نے بھی حضرت مولانا رحمہ اللہ کے علم سے بہت فائدہ اٹھایا۔

ہندوستان کے علاوہ زامبیا، ملاوی، جنوبی افریقہ، برطانیہ، کینیڈا، پاناما تک لوگ فیضیاب ہوئے ہیں، انہیں بیانات کا ایک مجموعہ ''فیضِ ابرار'' کے نام سے اب تک دس جلدوں میں چھپ چکا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت رحمہ اللہ کے چند بیانات ایک ضخیم جلد میں پاکستان سے ''سبق آموز بیانات'' کے نام سے بھی چھپ چکے ہیں۔ اور حضرت رحمہ اللہ کی سوانحِ حیات بھی ''حیاتِ ابرار'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔

اب اس سلسلہ کی ایک اور کڑی یہ مجالس ہیں، جن کو میں نے ''مجالسِ خطیب الامت'' کا نام دیا ہے۔ حضرت رحمہ اللہ کی عادت تھی کہ جب آپ ہندوستان میں ہوتے تھے، تو عصر بعد روزانہ حضرت کے گھر پر مجلس ہوتی تھی، اس میں طلبہ کی خاص طور پر تربیت فرماتے تھے۔ علاوہ اس کے اسفار میں بھی حضرت مولانا رحمہ اللہ کی مجالس کا سلسلہ مختلف اوقات میں جاری رہتا تھا۔ حضرت مولانا اپنے سفرِ برطانیہ میں کچھ وقت مدینہ مسجد، کلپٹن میں بھی گذارتے تھے، وہاں رات کے بیان کے بعد حضرت رحمہ اللہ کی مجلس ہوتی تھی، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ کی مجالس علمی نکات سے پر ہوتی تھیں، ان مجالس میں بھی حضرت رحمہ اللہ نے علمی اور بڑی قیمتی باتیں ارشاد فرمائی تھیں، جواب

تک ''کیسیٹ'' یا'' سی،ڈی'' میں محفوظ تھیں، اور اس سے وہی حضرات فائدہ اٹھا سکتے تھے جن کے پاس اس کی کیسیٹ یا سی،ڈی محفوظ ہیں۔

بے اختیار جی چاہا کہ ان مجالس کو قلمبند کر دیا جائے، تا کہ ان کے فوائد بقاء کی قید میں آ جائیں اور ان کا نفع محدود نہ رہے، دیگر متوسلین و شائقین بھی محظوظ و مستفید ہوں۔ نیز ان کے مطالعہ سے جو حضرات حضرت کی ان مجالس میں حاضر ہوا کرتے تھے، ان کے لیے لطف مجلس تازہ ہو جایا کرے اور لطف حضوری حاصل ہو کر غم مہجوری کا کچھ تدارک ہو۔

بقول شاعر....

گویا آئینہ میں ہے تصویر یار	☆	جب بڑھا رنج جدائی دیکھ لی

اسی مقصد سے اس کو شائع کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبولیت نصیب فرمائیں۔آمین

احقر نے اس پر کام کرنے سے پہلے حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ نے ۱۹۸۹ء میں سرزمینِ برطانیہ میں مدینہ مسجد، کلیپٹن میں پورا رمضان المبارک گذارا تھا اور وہاں سورۂ یوسف کی تفسیر اپنے انوکھے انداز میں بیان فرمائی تھی، اسے سی،ڈی سے قلمبند کر لیا تھا اور وہ بھی بڑی کام کی چیز ہے، ارادہ تو اس سے پہلے اسے ہی شائع کرنے کا تھا، مگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ '' عرفت ربی بفسخ العزائم''، لہٰذا وہ کام ابھی کسی وجہ سے رکا ہوا ہے، اور ویسے بھی کسی کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے بقول حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: (۱) عمرِ نوح (۲) خزانۂ قارون (۳) صبرِ ایوب علیہ السلام۔ احقر کو اس کا بخوبی عملاً تجربہ ہو رہا ہے۔

بہر حال! دعا فرمائیں کہ وہ بھی صحت کے ساتھ جلدی سے چھپ کر منظرِ عام پر آجائے۔ خیر! فی الحال حضرت رحمہ اللہ کی دس مجالس حاضرِ خدمت ہے۔ حضرت رحمہ اللہ کی یہ مجالس جو مدینہ مسجد کلپٹن میں ہوئی ہیں، اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ کبھی تو مجلس میں موجود کوئی صاحب حضرت رحمہ اللہ سے کوئی سوال کرتے تھے، حضرت رحمہ اللہ اس کا تسلی بخش جواب دیتے تھے، اور کبھی حضرت خود کوئی مضمون اپنی طرف سے بیان فرماتے تھے۔

حضرت رحمہ اللہ نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، اس کے حوالے بھی اکثر جگہوں پر میں نے اپنی رسائی کے مطابق ذکر کر دئے ہیں، حوالوں کے سلسلے میں ایک بات کا خلاصہ بھی کرتا چلوں کہ یقیناً میں نے جن کتابوں کے نام حوالے میں ذکر کئے ہیں یہ بالکل ممکن ہے کہ حضرت نے وہ بات ان کتب میں دیکھ کر بیان نہ کی ہو، مگر چونکہ حضرت رحمہ اللہ کی بات اور وہ بات ایک ہی طرح کی تھی اور کتب بھی معتبر تھی، لہٰذا اس کو ذکر کر دیا گیا، اور یقیناً اس میں بعض کتب وہ بھی ہیں جو حضرت رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئیں، اور بعض کتب وہ بھی ہے کہ میرا گمانِ غالب یہ ہے کہ حضرت رحمہ اللہ نے وہ بات اس کتاب کے مطالعہ کے بعد کہی ہوگی، اور بعض حوالے فیض ابرار کے بھی دئے ہیں، جو حضرت رحمہ اللہ کے بیانات کا ایک قابلِ قدر علمی مجموعہ ہے۔

میں نے اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہ رہ جائے، مگر بہر حال انسان انسان ہے اور بقول حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ نسیان کا مادہ خود انسان میں موجود ہے، لہٰذا اگر کوئی غلطی قارئین کو نظر آئے تو اس سے احقر کو مطلع فرمائے، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر لی جائے۔ اور ہاں! اس غلطی کو میری کوتاہی سمجھا جائے کہ مجھ سے اسے قلمبند کرنے میں کوتاہی ہو گئی ہو، نہ کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ کی ذات کی طرف اسے منسوب کیا جائے، اور ان باتوں سے جن حضرات کو نفع پہنچے

وہ خاص طور سے کچھ ایصالِ ثواب حضرت رحمہ اللہ کی روح کو پہنچادیں، اور احقر کے لیے دین پر استقامت کی دعا بھی فرمائیں۔

اخیر میں میں حضرت مولانا منور حسین صاحب سورتی دامت برکاتہم (امام وخطیب بالہم مسجد، لندن) کا بے حد ممنون ومشکور ہوں کے انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر سات مجالس کومن وعن دیکھا اور بعض جگہوں پر ضروری اصلاح بھی فرمائی، اور اس پر مزید اپنے چند تاثرات بھی میری خواہش پر تحریر فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا بہترین صلہ انہیں دارین میں نصیب فرمائیں۔ آمین

اسی طرح میں حاجی سلیمان بھائی بنگلہ دیش والے کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کے انہوں نے اس مجالس کو کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کے لیے میری مالی مدد فرمائی، اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کی فیمیلی کو دنیا و آخرت میں اس کا بہتر سے بہتر بدلہ نصیب فرمائیں اور ان کی جائز حاجات کو پوری فرمائیں۔ آمین

اسی طرح میں قاری عبد الرحمٰن بھڑ کودروی کا بھی شکر گذار ہوں کے جنہوں نے اس مجلس کی کمپوزنگ کی خدمت انجام دی اور اس میں خصوصی دلچسپی دکھلائی، اللہ تعالیٰ انہیں بھی دارین میں اس کا بہترین بدلہ نصیب فرمائیں۔ آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

محتاجِ دعا

بندہ: عبد السلام ابراہیم مارویا لاجپوری

حال مقیم، کلپٹن، لندن، یو، کے

۱۰ ر محرم الحرام ۱۴۳۲ھ بمطابق ۱۶ ر دسمبر ۲۰۱۰ء

مجلس نمبر (۱)

طاعات کی روح ذکر اللہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس نمبر (۱)

ہر طاعت کی روح ذکر اللہ ہے

﴿ یأیھا الذین اٰمنوا اذکر اللّٰہ ذکرا کثیراً ﴾ (سورۂ احزاب، آیت نمبر ۴۱)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے لوگو! جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو، ذکرِ کثیر کرو، اور مؤمنین کی صفات بھی یہی بیان کی گئی ہے کہ ﴿ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ﴾ (سورۂ احزاب، آیت نمبر ۳۵) معلوم ہوا کہ مؤمن کی صفت کثرتِ ذکر ہے اور منافقین کے بارے میں قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ﴿ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ٥ مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَاءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَاءِ ﴾ (سورۂ نساء، آیت نمبر ۱۴۲، ۱۴۳) ''وہ اللہ تعالیٰ کو بہت تھوڑا یاد کرتے ہیں''، تو منافقین کی صفت ذکرِ قلیل ہے، اور مؤمنین کی صفت ذکرِ کثیر ہے، بلکہ پہلے سمجھ لیں کہ ہر طاعت کی روح ذکر ہے۔

نماز سب سے اہم فریضہ ہے اسکے متعلق فرمایا کہ ﴿ أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي ﴾ (سورۂ طٰہٰ، آیت نمبر ۱۴) روزے کی روح بھی یہی ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ ان کے روزے کا حاصل بھوک کے سوا کچھ نہیں، اور بہت سے جاگنے والے ایسے ہیں کہ سوائے شب بیداری کے کچھ نہیں (ابنِ ماجہ) یعنی حقیقت حاصل نہیں۔ تو روزے کی حقیقت تذکر وتیقظ ہے، اور اس کے خلاف ہے غفلت اور غفلت ہی منشاء ہے معصیت کا۔

اسی طرح لوگوں کو دینا، دلانا اس کی روح بھی وہی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا، وہ ذکرِ قلبی ہے، اسی لیے اگر اس میں ریا آ گیا تو عمل ختم ہو گیا، بے جان ہو گیا کہ یہ تذکر ہی

نہیں رہا کہ خدا کے لیے ہے، اسی لیے دایاں ہاتھ خرچ کرے تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو، اس کو پسندیدہ قرار دیا (بخاری شریف) تو اس کی روح بھی یادِ حق ہے۔ حج کے باب میں فرمایا کہ ﴿ وَاذْكُرُ اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآئَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْراً ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۲۰۰) چونکہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنے آباء واجداد کا تذکرہ کرتے تھے، تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ تو معلوم ہوا کہ ہر طاعت کی روح اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

بائیسویں پارے کہ دوسرے رکوع میں فرمایا گیا کہ ﴿ إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰت إلخ ﴾ (سورۂ احزاب، آیت نمبر ۳۵)، پوری ایک لیسٹ ہے طاعتوں کی، پھر ان تمام طاعات کی جو روح ہے اس پر خاتمہ ہے ﴿ والذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْراً وَّالذّٰكِرٰتِ ﴾ (سورۂ احزاب، آیت نمبر ۳۵) معلوم ہوا کہ ان سب طاعتوں کی روح جو ہے وہ یادِ حق ہے، خود انسان جو ہے اس کی روح بھی ذکر ہے، اسی لیے جس میں روح ہے وہ زندہ ہے اور جس میں روح نہیں ہے وہ مردہ ہے اور روح ذکر ہے، اس لیے جو ذاکر ہے وہ زندہ اور جو غافل ہے وہ مردہ۔

حدیث شریف میں فرمایا کہ:" مثل الذي يذكر ربه والذي لا يذكر مثل الحي والميت " (متفق علیہ)۔

اسی طرح انسانوں کی مجلس کی روح بھی ذکر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ”جس مجلس میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر نہ ہو وہ مجلس ایسی ہے جیسے مردہ لوگ جمع ہوں“ (مسندِ احمد) ایسی مجلس کا مردار پن قیامت میں کھلے گا تو مردہ ہونا زندگی کے خلاف ہے اور زندگی ذکر ہے اللہ کی یاد۔ تو انسانوں کی روح بھی، ان کے اعمال کی روح بھی اور مجلس کی روح بھی یادِ حق ہے، پورے عالم کی روح بھی ذکر ہے۔ اور فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ کوئی ایک آدمی بھی روئے زمین پر اللہ اللہ کرنے والا

موجود ہو (مسلم شریف)۔تو ذکر چلا گیا تو عالم بھی ختم ہو جائے گا،تو انسان اس کے سارے متعلقات سب کی روح ذکر ہے، پھر ذکر کی حقیقت ہے یاد، قرآنِ کریم کو بھی ذکر کہا گیا ہے ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ ﴾ (سورۂ حجر، آیت نمبر: ۹)۔ جلالین کے سبق میں میں نے اپنے یہاں قرآنِ کریم کے پینتیس اسماء ذکر کئے تھے ان میں ایک ذکر بھی ہے ذکریٰ بھی ہے، تذکرہ بھی ہے (تفسیر عزیزی، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۱۶۲) جو ذکر کے معنی میں ہے، اور ذکر کہتے ہیں یاد کو، تو معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم خود یاددہانی کے لیے آیا ہے، مگر یاد اسے کیا جاتا ہے پہلے جس کا تذکرہ گیا گیا ہو، تو وہ جو " ألست " کا عہد ہوا ہے ﴿ ألست بربکم ﴾ (سورۂ اعراف، آیت نمبر: ۱۷۲) اس عہد کی یاد دہانی مقصود ہے، تو بھولتا ہے آدمی اس کو یاد دلانا یہ ذکر ہو گیا، یا انسانوں کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی جو استعداد ہے ،اس کو فراموش نہ کرے آدمی اور ذکر سے وہ محفوظ رہتی ہے اور غفلت سے ختم ہو جاتی ہے، تو معلوم ہوا کہ نماز کی، روزہ کی، زکوۃ کی، حج کی، خود انسان کی، اس کی مجلس کی، عالم کی اور خود قرآنِ کریم کو ذکر کہا ہے، تو سب جگہ ذکر ہی ذکر ہے ﴿ والذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْراً وَّالذّٰكِرٰتِ ﴾ (سورۂ احزاب، آیت نمبر: ۳۵)۔

ذکر کی تین قسمیں ہیں:

پھر ذکر کی تین قسمیں ہیں: (روضة المحبين و نزهة للمشتاقين) ایک ذکر ہے عملی کہ جس موقعہ سے متعلق جو حکم خدا و رسول ﷺ کا ہے اس کو اختیار کرنا یہ عملا ذکر ہے مثلاً لین دین کر رہے ہیں دھوکہ نہیں دیا جھوٹ نہیں بولا شرعی حکم کو ملحوظ رکھا تو یہ لین دین جو ہوا ذکر والا ہوا یہ عملا ذکر ہے، آپ ترازو تول رہے ہیں ڈنڈی نہیں مارتے یہ عملاً ذکر ہے اور اگر ہاتھ میں تسبیح لے کر بیٹھے ہیں اور ڈنڈی بھی مار رہے ہیں تو لسان سے ذاکر ہے مگر عمل سے غافل ہے (فیضِ ابرار ج ۵ ص ۶۰)۔ ایسے ہی ہر معاملے میں معاشرت، معیشت،

معاملات وغیرہ، تو جتنے بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں تو جس موقعہ پر جو معاملہ ہے وہ صحیح ہے تو وہ عمل ذکر ہے، مثلاً آپ نے شادی کی لیکن بیوی کو مہر نہیں دیا تو یہ غفلت ہے اور دے دیا تو یہ ذکر ہے عملاً۔ کھانے بیٹھے اور کھانا حلال ہے تو یہ عملاً ذکر ہے۔

اور دوسری صورت ہے ذکرِ لسانی زبان کا ذکر، حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ " لا یزال لسانك رطباً من ذکر اللّٰه " أو کما قال علیه الصلاۃ والسلام (ترمذی)۔ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تر رہے " رطب اللسان "محاورہ بھی ہے کہ آدمی کسی کا تذکرہ کرتا رہتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں نہ فلاں نے کے ذکر میں رطب اللسان رہتا ہے، یعنی اس کی زبان اس کے ذکر سے تر رہتی ہے۔ اور صوفیاء تو لکھتے ہیں کہ واقعۃً بھی حلاوت محسوس ہوتی ہے حسی طور پر بھی۔

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است کلام	☆	شیر وشکر می شود جانم تمام

تو یہ ذکرِ لسانی ہے۔

اور تیسرا درجہ جو ہے وہ سب سے اعلیٰ ہے وہ ذکرِ قلبی ہے، مگر ہے دشوار۔ زبان سے ذکر وہ ذکر ہے اور وہی قلب میں چلا جائے تو اس کو ذکر بھی کہتے ہیں اور فکر بھی کہتے ہیں۔

اسی لیے فرمایا گیا: ﴿ إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُولِيْ الْأَلْبَابَ ﴾ (سورۂ آلِ عمران، آیت نمبر: ۱۹۰)

بیشک آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور دن کا آنا جانا اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کو۔ عقلمند کون ہے ﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ ﴾ کہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں ﴿ قِيٰماً وَّقُعُوْداً وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے بھی تو ﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰه الخ ﴾ یہ ذکر ہوا، اور یہی ذکر بڑھتے بڑھتے بڑھتے ﴿ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

وَالْأَرْضِ ﴾ یہ فکر شروع ہوگیا، تو ذکرِ قلبی فکر ہے اور اس کا اثر معرفت ہے ﴿ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ اور اس معرفت کا اثر عبدیت ہے کہ دعا کر رہے ہیں ﴿ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ (سورۂ آلِ عمران، آیت نمبر: ۱۹۱) تو ذکر لے گیا فکر پر اور فکر لے گیا معرفت پر اور معرفت جو ہے لے گیا عبدیت پر، اور اب دعاء جو مخ العبادت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ " الدعاء مخ العبادۃ " (ترمذی) تو دعا ہو رہی ہے ﴿ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ یہ ذکرِ قلبی کہلاتا ہے۔

اور ذکر کی حقیقت جو ہے بقول حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ ذکر درحقیقت قلب کی صفت ہے، کیسے؟ ایک آدمی آپ کے ساتھ بات کر رہا ہے، مگر دھیان اس کا اپنے محبوب کے ساتھ ہے تو معلوم ہوا کہ آپ سے جو گفتگو ہے اس میں آپ کی طرف جو التفات ہے وہ صرف صورۃً ہے، اسی لیے ایک شخص ذکر رہا ہے کہ سبحان اللہ، سبحان اللہ، مگر اس کے قلب میں ہے دکان، پاؤنڈ، ڈالر وغیرہ، تو وہ جو قلب میں جما ہوا ہے بسا ہوا ہے گھسا ہوا ہے درحقیقت وہی مذکور ہے کہ "سمجھو ہم ہیں وہیں جہاں دل ہو ہمارا"۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ مکہ شریف کا قیام افضل ہے یا ہندوستان کا؟ فرمایا دیکھو بھائی! بدن ہندوستان میں رہے اور دل مکہ میں رہے، یہ اچھا ہے اس سے کہ بدن مکہ میں رہے اور دل ہندوستان میں رہے۔ (خطباتِ حکیم الامت ج۸، ص: ۲۸۹) معلوم ہوا کہ روح نہیں ہے اس میں، تو معلوم ہوا کہ اصل یاد دل کی یاد ہے، اسی لیے ایک شخص زبان سے خاموش ہے، مگر دل اس کا کسی کے ساتھ لگا ہوا ہے، تو یہی ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان زبان کی صفت نہیں ہے قلب کی صفت ہے (ترجمان السنۃ) اور جب قلب کی صفت ایمان ہے تو معلوم ہوا کہ قلب میں جو چیز بیٹھی ہوئی ہے وہ نیند

کی حالت میں بھی ہٹی نہیں ہے، لہٰذا سونے والا بھی مؤمن ہے، ورنہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جاگتا ہوتو مؤمن اور سویا تو کافر ''سویا تو کھویا''۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے کسی نے کہا کہ حضرت ایمان کی حالت میں جو حضور ﷺ کو دیکھے وہ صحابی ہے اور میں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے لہٰذا میں بھی صحابی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ منامی صحابی ہے کہ آپ سوئے وہاں تک صحابی اٹھنے کے بعد پھر ختم، کیونکہ اس کے لیے تو بیداری شرط ہے۔ (فضل الباری شرحِ بخاری ج ۲، ص: ۱۳۵)

ذکرِ قلبی کیسے حاصل ہو؟

اب ذکرِ قلبی حاصل کیسے ہو؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دھیان کسی کا جمانا ہوتو اس کو دیکھا ہوا ہونا چاہیے اور اللہ میاں کو تو ہم نے دیکھا نہیں ہے، تو اب اس کا دھیان کیسے جمے گا؟ یہ پتے کا سوال ہے۔ کسی مراقبہ کرنے والے سے اگر کوئی یہ سوال پوچھ لے اور وہ محقق نہ ہوتو وہ سوچ میں پڑ جائے گا، کیونکہ آپنے اگر کسی کو دیکھا ہوتو دیکھنے کی وجہ سے اس کا ایک نقشہ ذہن میں ہوتا ہے، لیکن جو غائب ہو اور جس کو دیکھا نہ ہوتو اس کا دھیان کیسے جمائیں؟ اس پر مستقل پھر بحث کی ہے۔

ایک شکل اس کی یہ ہے کہ قلب پر کوئی ایسا تصور کرے، جیسے مثلاً سونے کا ورق ہے اور اس پر سفید چاندی کے حروف سے لفظ ''اللہ'' لکھا ہوا ہے اور واقع میں لفظِ اللہ بھی عجیب اسم ہے اگر اس کا اول اور آخر کا حرف لے لیں تو ''آہ'' بنتا ہے، معلوم ہوا کہ اس نام کو لینے میں درد ہونا چاہیے، تو سمجھ میں آیا کہ اس کا اول اور آخر کیا ہے ''الف'' اور ''ہ''، اور وہ ''آہ'' بنتا ہے، اور یہ ''آہ'' بھی دکھاوے کی نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ بیچ میں ''للہ'' ہے معلوم ہوا کہ اس کا شور بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو، شو کے لیے نہ ہو، اگرچہ صوفیاء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی ذکر اللہ دکھلاوے کے لیے کرتا ہو تب بھی اس کو

حقیر نہ سمجھو، اور اس کی مثال دی حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اِملی کی کہ اِملی کی خاصیت یہ ہے کہ صرف اس کا تصور بھی کرو تو منھ میں پانی آتا ہے تو رسمی ذکر جو ہے یہی ہوتے ہوتے کل کو جاکر قلب میں رقت کا پانی پیدا کردے گا اور اس کا کام بن جائے گا اور اس کی اصل تاثیر اس میں پیدا ہوجائے گی (ملفوظاتِ حکیم الامت)۔

اس لیے ذکر اللہ نفع سے خالی نہیں ہے تو ایک شکل تو یہ ہے۔ پھر یہ چیز اصل میں ذوقی ہے کہ ہوتے ہوتے ہوتے ہوتے تو پہلے تو اسماء کا تصور ہوگا اس کا نام کثرت سے لیتے لیتے پھر اس کے بعد خالق پر توجہ ہوگی شئی کی، اور توحیدِ افعالی کی حقیقت یہ ہے جو حضرت مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کے مواعظ میں بہت زیادہ ہیں۔ اور افعال فعل کی جمع ہے اور فعل کرنا ہے، گویا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، ایک ہی فاعل یہ توحید کا دوسرا درجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ کرتے ہیں ہر شئی یہ سب صورتیں ہیں اور اصل وہی ہے، جیسے ایک شخص کو غلبہ ہوا وہ یہ کہ ایک شخص ہاتھی پر بیٹھ کر آرہا ہے ایک مسئلہ ہے سلوک کا کہ ''ہمہ اوست'' سب وہی ہے (انفاسِ عیسیٰ) اس کی حقیقت سمجھ لیں'' ہمہ اوست'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سامنے سب اوجھل ہے، اصل وہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہے وہ بھی وہی ہے کہ چیونٹی ہے وہ بھی وہی ہے، تو ایک آدمی سوار تھے ہاتھی پر اور ہاتھی جو ہے بگڑا خفا ہوکر ایکدم بھاگا اس کے اوپر جو آدمی بیٹھا تھا اس نے چلانا شروع کیا کہ ہٹو، دوڑو، بھاگو، یہ چلانا شروع کیا۔ اب ایک شخص ایسے تھے وہ اسکے قائل تھے کہ'' ہمہ اوست'' کہ سب کچھ ادھر سے ہے ہاتھی کیا چیز ہے۔ اس واقعہ کو ایک بڑے شخص نے سنا انہوں کہا کہ اگر ہاتھی کی دوڑ اس طرف سے تھی یعنی اللہ تعالی کے امر سے تو ہٹو بچو کا بول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تھا تمہاری نظر اس کے اوپر کیوں نہیں گئی۔ (فیضِ ابرار ج۵، ص: ۱۳۱) یہ وہ فلسفہ ہے جہاں پیغمبر اس چیز کو اختیار کرتے ہیں کہ سبب بھی اختیار کرتے ہیں مگر نظر

مسبب الاسباب پر ہوتی ہے کہ جنگ میں جا رہے ہیں اور زرہ بھی پہن رہے ہیں (سیرۃ المصطفی) مگر نظر ادھر ہی ہے۔

اسی لئے پیغمبر کا رابطہ غیب سے اتنا قوی ہوتا ہے کہ کبھی تو وہ غیب میں جاتے ہیں جیسے معراج ہے (بخاری شریف) اور کبھی غیب ان کے سامنے آتا ہے کہ نماز میں جنت کا پھل دیکھ رہے ہیں (بخاری شریف) اتنا قوی رابطہ ہوتا ہے پیغمبر کا کبھی منقطع نہیں ہوتا۔

توحید کا پہلا درجہ توحیدِ اسماء ہے

تو سب سے پہلا درجہ توحیدِ اسماء کا ہے۔ توحید کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور ایک بھی ایسا کہ اس کی کوئی نظیر مثیل نہیں ہے مستقل، ورنہ آپ خود اپنی ذات سے ایک ہے، پہلے اسم کے اعتبار سے سمجھ لیں جیسے " القادر " اللہ قدرت والے ہیں، تو " القادر " کے اندر جو مفہوم ہے توحید کا وہ یہ ہے کہ قادر تو بہت سے ہیں، یہ قادر وہ قادر قدرت والے، مگر سب کی قدرتیں ناقص اور کامل قدرت حق تعالیٰ کی ہے، تو اسماء سے اس کا دھیان جمنا شروع ہوگا۔

توحید کا دوسرا درجہ

پھر درجہ ہے افعال کا کہ فاعل وہی ہے مثلاً آپ باہر نکلے اور دیکھتے ہیں آپ کہ کھیت میں جو ہے سبزہ اُگ رہا ہے اب ایک کی نظر جاتی ہے پانی پر اور دوسرے کی نظر جاتی ہے اللہ تعالیٰ پر اور اس عالم میں جتنے افعال لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں وہ بظاہر انسان کے افعال ہیں، لیکن گھوم پھر کر پھر وہیں جاتا ہے۔ میرے حضرت رحمہ اللہ نے ایک مثال دی کہ ایک آدمی نے ایک شخص کو قتل کیا اور قاتل کو پکڑ لیا گیا اس کو کورٹ میں لے گئے، جج نے فیصلہ سنایا کہ اس کو بھی قتل کردو، اب اس معاملہ میں لوگوں نے غور کرنا

شروع کیا کہ یہ کیوں مارا گیا اس کی وجہ کیا ہے؟ ایک نے کہا کہ یہ اس لیے مرا ہے کہ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا رکھ دیا گیا۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں بلکہ یہ اس لیے مرا ہے کہ جلاّد نے اس کے پیر کے نیچے سے تختہ ہٹا دیا، یا مثلاً جلاّد نے اس کی گردن پر تلوار ماری اس لیے مرا۔ تیسرا کہتا ہے کہ یہ بھی غلط جلاّد جو ہے وہ تو تابع ہے جج کے ججمینٹ کے، لہٰذا جج کا ججمینٹ سبب بنا ہے اس کے قتل کا۔ چوتھے نے کہا یہ بھی غلط اس کا قتل ہونا خود اس کا دوسرے کو قتل کرنا ہے یہ قتل نہ کرتا تو اس کو بھی قتل نہ کیا جاتا۔

(خطباتِ حکیم الامت، ج۲ص۱۲۶، ۱۲۷)

دیکھئے! بیچ میں ایک ضمنی بات بتا رہا ہوں کہ قاتل نے کسی کو مارا تو مارنے کا کوئی وقت ہوگا، چاہے دن کا چاہے رات کا کوئی تو وقت ہوگا، تو اس نے خدا کی ایک نعمت وقت کو غلط استعمال کیا تو وہاں جج کو تنخواہ گورنمینٹ اس لیے دیتی ہے کہ وہ ان کاموں کو انجام دینے کے لیے اپنا ٹائم پیش کریں، تو معلوم ہوا کہ جب اس نے وقت کا غلط استعمال کیا تو اللہ تعالیٰ نے وقت کو ہی اس کے خلاف استعمال کیا، پھر اس نے جب قتل کا پلان بنایا تو یہ سوچا ہوگا کہ اس کو چھری سے یا چاقو یا کسی اور چیز سے ماروں گا، دماغ بھی خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اس کا اس نے غلط استعمال کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے خلاف جج کے دماغ کو استعمال کروایا کہ اس کو پھانسی دو، تو جو اپنے دماغ کو غلط استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی دوسرے دماغ کو اس کے خلاف استعمال کرواتا ہے، اور اس نے جب کسی کو مارا تو اس کے لیے تلوار یا چاقو یا لکڑی کسی مادّی چیز کو استعمال کیا ہوگا تو وہاں بھی تختہ ہے، رسّا ہے، کرنٹ ہے وغیرہ مادی چیز اس کے خلاف استعمال کی جاری ہے۔ اچھا! اب وہ اسے مارنے کے لیے تلوار یا بندوق یا کوئی بھی چیز لایا ہوگا تو اس نے پیسہ کا غلط استعمال کیا، ادھر حکومت جلاد کو پیسے اسی لیے دیتی ہے کہ وہ اس کام کو انجام دے، تو معلوم ہوا

کہ اس نے جو جو چیز قتل کے لیے استعمال کی اللہ تعالیٰ نے اُنہیں چیزوں کو اس کے خلاف استعمال کیا، یہاں پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جو دوسرے کو قتل کیا وہ دوسرے کو قتل کرنا خود اس کے قتل کا سبب بنا ہے، جلاد سبب نہیں ہے، تلوار سبب نہیں ہے اور فلاں اور فلاں سبب نہیں ہے، بلکہ سبب اس کا خود عمل ہے یہ سب واسطے ہیں، لیکن اصل بنیاد وہی ہے۔
(فیضِ ابرار ج ۵، ص ۱۲۷)

یا مثال کے طور پر ہم کائنات میں ایک سلسلہ دیکھتے ہیں کہ ایک سلسلہ ہوتا ہے اور وہ ایک خاص نکتہ پر جا کر پہنچتا ہے، اب لوگوں کی نظر اس سلسلہ پر نہیں ہوتی، مگر وہ برابر کام کرتا ہے۔ اس کو آپ ایسے سمجھ لیں جیسے مثلاً یہ بتّی ہے اب ایک دیہات کا آدمی بیٹھا ہوا ہو اور اس نے یہ دیکھا کہ بتی جلی اور ٹیوب لائٹ کی روشنی آئی، مگر اس روشنی کے آنے میں اس کے پیچھے وہ کونسی چیزیں ہیں جو کام کر رہی ہیں کہ جس کے نتیجے میں یہ روشنی کا وجود ہوا وہ دکھائی نہیں دیتی۔ اچھا! جب وہ دکھائی نہیں دیتی تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو خود سے ہوئی، ایسے ہی مزاج کا ایک آدمی تھا میں نے اس کو اسی پر پکڑا۔ مجھ سے وہ کہنے لگا کہ سب کچھ خود سے ہوتا ہے اور اس نے دلیل میں یہ بات پیش کی کہ بارش کے موسم میں بارش برسی اور سینکڑوں چھوٹے چھوٹے پودے وجود میں آ گئے اس کو کس نے پیدا کیا وہ تو خود سے پیدا ہو گئے، میں نے کہا سبحان اللہ، واہ واہ! میں نے اس کو کہا کہ دیکھو زمین پر بارش کا پانی گرا تو اس بارش کے پانی میں اور زمین میں کتنے اجزاء تھے جس میں جراثیم کی صلاحیت موجود تھی؟ ان صلاحیت کو ظاہر میں لانے کے لیے اصل چیز امرِ الٰہی ہے، اس لیے یہ پودے وجود میں آئے جو کہ پوشیدہ ہے میں نے کہا تم صرف ظاہر کو دیکھ رہے ہو، تو یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ٹیوب لائٹ کو دیکھ کر کہے کہ اس کے پیچھے کچھ نہیں ہے یہ تو خود سے روشن ہوگئی تو سائنس کی لائن کا ایک بچہ بھی کہے گا کہ تم سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہے، سیدھی سی بات ہے۔ اچھا تو دوسرے نمبر پر توحیدِ افعالی ہے۔

توحیدِ صفات کی تعریف

پھر توحیدِ صفات ہے، کیا مطلب صفات کا کہ جہاں کہیں جو بھی کسی میں صفت ہے وہ اس کی اپنی ذاتی نہیں ہے، مثلاً آپ کے پاس علم ہے تو آپ یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقی علم تو حق تعالیٰ کا ہے اور میرے پاس جو ہے وہ تو صرف ایک معمولی خاکہ ہے علم کا، اسی طرح ہر چیز کا حال ہے چاہے وہ طاقت ہو، کمال ہو، جمال ہو، جو کچھ بھی ہو، تو ہوتے ہوتے صفات پھر ذات پر پہنچائے گی۔ اچھا! یہ فکر اندر اس طریقہ سے بنتا ہے کہ جب صفات سے نظر ہٹ گئی مثلاً ایک آدمی ہے اور اس میں کچھ صفتیں ہیں، مثلاً علم ہے تو اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میرے اندر تو علم ہے تو اگر اس کی نظر اپنے علم پر ہے تو صفت کی معرفت نہیں ہے، صفت کی جو حقیقی فکر ہے وہ نہیں ہے اور جب اپنی صفت سے نظر ہٹ گئی اور خدا کی صفت پر نظر ہے، تو وہ جو دو لفظ ہوتے ہیں ''فانی فی اللہ''، ''باقی باللہ''۔

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے
اور تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

وہ ساری چیزوں کو اس نے فنا کیا اور یہ فنا کرنا اختیاری ہے کہ اپنے وجود کو فنا کردو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ بندوق لے کر اپنے آپ کو ماردو۔ بس! یہ سمجھو کہ " أرید أن لا أرید وأختار أن لا أختار " ''میں ارادہ کرتا ہوں کہ کوئی ارادہ ہی نہ کروں اور میں اختیار کرتا ہوں کہ کچھ اختیار ہی نہ کروں'' یہ تفویض کا مقام ہے، اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ جس طرح سونے والے کو یہ خبر نہیں ہوتی ہے کہ میں سو رہا ہوں۔

توکّل کے تین درجے ہیں:

اور تفویض کے تین درجہ لکھے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ جیسے مؤکل کو اپنے وکیل پر اعتماد ہوتا ہے یہ ادنیٰ درجہ کا توکل ہے، مثلاً آپ نے کوئی وکیل رکھا اپنے کام کے لیے، اب

وہ آپ کو اطمینان دلاتا ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے، لیکن کچھ ڈر بھی ہوتا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہوگا، تو دونوں اندیشے ہوتے ہیں، ایک صورت تو یہ ہے۔

دوسری صورت اس سے بڑھ کر توکّل کہ بچہ کو ماں باپ پر جو اعتماد ہوتا ہے کہ صبح کو اس نے چائے ناشتہ کرلیا، اب اس کو دوپہر تک یہ فکر نہیں ہے کہ کیا کھائیں گے، کہاں سے کھائیں گے، کس طرح آئے گا، کچھ نہیں بھوک ہوئی کہ تقاضہ شروع کر دیا کہ کھانا لاؤ، بچوں کو کچھ فکر ہے؟ کچھ بھی نہیں یہ درجہ پہلے درجہ سے بڑھ کر ہے۔

اس سے اعلیٰ درجہ ”کالمیت في يد الغسال“ کہ جیسے مردہ ہوتا ہے غسل دینے والے کے ہاتھ میں کہ اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا (رہنمائے سعادت تلخیص کیمیائے سعادت، ص: ۳۲۶) تو اپنی صفات کی فنائیت کی یہ کیفیت جب اندر ایک خاص درجہ میں آجائے تو یہی مقامِ رضا وتسلیم اور یہی مقامِ فنا کہلاتا ہے اور یہ بہت مشکل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی پڑا رہے، بلکہ وہاں یہ ہے کہ اپنی ساری صفات کو مرضیٔ حق میں فنا کردے کہ اپنی کوئی تجویز نہیں۔

اچھا! تو یہ کیفیت جو ہے اندر اندر جمتی ہے۔ اب میں اس کو سمجھانے کے لیے ایک لطیفہ سنادوں، نرولی میں ایک شخص ہے اب وہ بوڑھے ہوگئے بیچارے، وہ ایک عورت کے عاشق ہوگئے، نام اس کا مریم تھا، ان کو اس سے اتنی محبت تھی کہ بستی میں کوئی نیا آدمی آیا ہو اور ان سے یہ کہا جاتا کہ یہ عامل ہے اور وہ مریم سے تمہارا تعلق ختم کردیں گے تو وہ اس سے ناراض ہوجاتے، حالانکہ اس بات کا نہ سر نہ پیر اور وہ کیفیت ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچی کہ تسبیح لے کر مسجد میں گئے، کسی نے پوچھا کہ موٹا کیا کرتے ہو، تو تسبیح بتاتے ہوئے کہا کہ اس میں مریم نظر آتی ہے، تو تسبیح میں بھی ان کو ان کی مریم دکھتی تھی، تو یہ مثال ہے سمجھانے کے لیے۔ تو یہ کیفیت جب جمنا شروع ہوتی ہے تو ہوتے ہوتے

پھر یہ ہوتا ہے کہ بس ہر طرف یہی جلوہ ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے دقیق جیسے یہ دیوار ہے ہم اس کو دیکھتے ہیں تو ہم نے اس کو نہیں دیکھا پہلے، بلکہ پہلے نور دیکھ رہے ہیں اور وہ نور دیوار کو دکھا رہا ہے اگر آپ اس حقیقت کو نہیں مانتے تو ہم کہیں گے کہ آپ یہ بتی بند کردیجئے اور پھر دیکھئے نہیں دیکھ سکتے، تو معلوم ہوا کہ آپ ڈائریکٹ دیوار کو نہیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ وہ نور آپ کو دکھلا رہا ہے، تو کائنات کا جو وجود ہے وہ وجود گویا عدم ہے، یعنی اس کا وجود نہیں ہے، بلکہ اللہ جل شانہ کی مشیت اور اس کے امر سے اس کو وجود ملا ہے، اسی لیے صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بڑے موحد تھے، وہ فرماتے ہیں کہ ” ما رأیت شیئاً إلا رأیت اللّٰہ قبلہ “ کہ ”میں نے ہر شئی سے پہلے اللہ تعالیٰ کو دیکھا“۔

توحیدِ صفات کے دو طریقے

دیکھو! دو طریقے ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ کہیں دھواں دیکھا آپ نے تو آپ نے قیاس کیا کہ کہیں آگ ہوگی، یہ جو ہے اثر سے اصل کی طرف چلنا ہے دھویں کو دیکھ کر آگ کی طرف چلنا۔ اور ایک ہے آگ سے دھویں کی طرف چلنا، یہاں آپ یہ سمجھ لیں ایک تو یہ ہے کہ جیسے عام لوگوں کی نظر ہوتی ہے کہ درخت کو دیکھا اور وہ کہنے لگے کہ اس کو قدرت نے اگایا ہے، یا زمین ہے آسمان ہے پہاڑ ہے وغیرہ اس کو دیکھا اور کہا کہ واقعی اس کو بنانے والا کوئی ہے، تو یہ ہے صفات سے ذات کی طرف چلنا۔ اور وہاں قصہ یہ ہے کہ پہلے ہی سے ذات کا استحضار ہے اور وہ کیفیت اتنی جمی ہوئی ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیکھ رہے ہیں کہ پہلے وہ اصل ہے اور یہ مشاہدہ کے درجہ میں ہے، اور اب عالم کو دیکھتے ہیں تو گویا اس کا وجود ہی نہیں ہے، تو ادھر سے ادھر آنے کے بجائے وہ ادھر سے ادھر جا رہے ہیں اور یہ بہت مشکل چیز ہے اور یہ آخری مقام ہے نزول کا مقام ہے، جیسے درخت پر چڑھنا آسان

ہوتا ہے اترنا زیادہ مشکل ہے، تو آدمی کا ایک درجہ یہ ہوتا ہے جس میں وہ ادھر متوجہ ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رخ ہے پھر اللہ تعالیٰ کی صفات میں فنا ہے پھر فعل من اللہ ہے گویا گیا اور اس کے بعد پھر وہ ریٹرن ہوا اور یہ جو ہے افادہ اور فائدہ پہنچانے کا ایک مقام ہے یہ پیغمبر کا یہ مقام ہے انبیاء کرامؑ کا یہ مقام ہوتا ہے کہ باطن سے تو وہ عرشی ہے اور ظاہر سے فرشی ہے، عرش پر رہتے ہیں اور مخلوق کے ساتھ سارا معاملہ کر رہے ہیں۔ وہی جو نہر والی مثال دی تھی کہ ایک اس کنارے پر ہے اور ایک اس کنارے پر ہے، تو ایک نے تو پورا دریا طے کرلیا اور اس کنارے پر ہے اور دوسرے نے ابھی قدم بھی نہیں رکھا ہے مگر کنارے کنارے میں دونوں برابر ہیں آنے والا دیکھے گا کہ یہ بھی ساحل پر ہے اور وہ بھی مگر ایک پورا پار کر کے آیا ہے اور دوسرے حضرت وہیں بیٹھے ہیں، تو کھانا پینا عام زندگی یہ وہ یہ کام کافر و مشرک اور منافق بھی کرتے ہیں اور اہلِ کتاب اور مسلمان سبھی کرتے ہیں، تو یہ سادہ حال ہے۔ اور ایک حال وہ ہے کہ اندر سے عروج کر کے پھر وہ اس مقام پر لوٹے ہیں، سمجھ میں آیا نا کہ بحرِ معرفت طے کیا ہوا ہے، یہ فرق ہے کہ ایک مبتدی منتہی میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ (فیضِ ابرار، ج ۱۰، ص: ۲۸۸)

تو ذکر کی یہ کیفیت جو ہے یہ بہت آخری درجہ کی ہے، اس لیے اس میں پھر کچھ چیزیں وہ ہوتی ہیں جو یکسوئی کا باعث ہوتی ہیں، جیسے مثال کے طور پر بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ شیخ بتاتے ہیں کہ کان میں انگلی ڈالو اور یہ موٹی سی بات ہے کہ ہوا ہر جگہ ہوتی ہے، تو آپ کی انگلی جانے کے بعد کان کے پردے اور انگلی کے بیچ میں جو ہوا ہے اس میں ایک قسم کی آواز پہلے سے پہنچ گئی ہے، چونکہ آواز فضاؤں میں ہے آواز کا مرکب ہی ہوا ہے، اچھا وہ اندر ہے تو اندر ایک کیفیت معلوم ہوگی آپ کو۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ زبان تالو سے لگالی جائے، آنکھ بند کردی جائے، اور کمرہ جو ہے بند ہو، اب کمرہ بند ہونے میں یہ ہے کہ آپ دیکھیں کمرہ بند ہو اور بتی جلتی ہو اور آپ آنکھ مینچیں (بند کریں) تب بھی روشنی کا

کچھ اثر آنکھ کے واسطے سے پہنچے گا اندر۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ بتی بجھے گی تو فرق معلوم ہوگا، یہی وجہ ہے کہ نیند کے عالم میں روح جو ہے اوپر کی طرف چلتی ہے اور اس کے اوپر کی طرف جانے میں اندھیرا مدد کرتا ہے، کیونکہ جب روشنی ہے تو وہ اندر سے باہر کی طرف متوجہ نہیں ہوگی، اسی لیے سونے کے لیے جو ڈیم لائٹ کا سلسلہ ہے یہ قدرتی نظام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو ہٹا کر چاند کو، یعنی جو ڈیم لائٹ ہے رکھ دیا ہے، تو یہ فطری چیز ہے۔

تو اب صورتِ حال یہ ہے کہ ذکر کی کثرت سے کرتے کرتے وہی دھیان جم جاتا ہے، اس کو موٹے لفظوں میں آپ اس طرح سمجھیں کہ آپ کسی چیز کو یاد کیجئے اور اس سے جوڑ پیدا کیجئے اور یاد کرتے کرتے دل دماغ آنکھ سب وہیں رہیں، تو قوتِ خیالیہ میں وہ چیز جم جائے گی اور خیال کی گردش نیند میں بھی ہوتی ہے، اسی لیے جو لوگ حفظ کلاس میں ہوتے ہیں بعض دفعہ نیند میں پڑھتے ہیں۔ میرے حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ احمد نگر تشریف لے گئے حاجی وزیر سیٹھ پونا کے مکان پر اور وہاں سوئے تو نیند میں حضرت نے تقریر شروع کر دی جس کو لوگوں نے محفوظ کر لیا (منتخب تقاریر، ص: ۳۷۷) تو میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ متخیلہ ایک شے ہوتی ہے۔

مقامِ یوسف

حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ یہ جو مضامین آپ بیان کرتے ہیں وہ کہاں سے اور کس کتاب سے دیکھتے ہیں، اور اخیر میں تو یہ کیفیت تھی فرمایا کہ مجھے صبح میں جو بولنا ہوتا ہے فجر بعد تو وہ باتیں رات میں خواب میں بتا دی جاتی ہیں۔

ذکر کی کیفیات نہیں ذکر مقصود ہے

اچھا! دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ ذکر سے ذکر کی کیفیات مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف

ذکر مقصود ہے، چنانچہ اس کو مثال سے سمجھ لیں؛ ایک چشتیہ سلسلہ کا آدمی ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے "لا إله الا اللّٰه" پھر یوں گردن ایسے پیچھے نکال کر قلب پر مارتا ہے، اب اس گردن ہلانے کو کوئی یہ سمجھے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرنے میں اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے میں کوئی دخل ہے تو بالکل غلط، مقصود ذکر ہے۔

گردن ہلانے کی وجہ

اب سوال یہ ہوگا کہ پھر یہ گردن کیوں ہلاتے ہیں؟ اس میں طب کے قاعدے سے ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ ایک سخت جھٹکے سے دل میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور گرمی سے دل نرم ہو جاتا ہے اور دل کی نرمی سے ذکر کا اثر ہوتا ہے اور ذکر کے اثر سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا خیال اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ (تسہیل قصد السبیل، ص: ۳۰)
جیسے دیوار میں کھونٹی نہیں جارہی ہو تو آپ زور سے ماریں گے تو وہ جائے گی اسی طرح قلب میں سختی ہے تو "إلا اللّٰه" کی ضربیں زور سے لگے گیں تو اثر پہنچے گا۔

ذکرِ جہری کی وجہ

اور پھر یہ کہ ذکر آواز سے کیوں؟ وہ اس لیے کہ آواز کی وجہ سے مبتدی کا ذہن اس پر جم سکتا ہے، اسی لیے ذکر مفرد کراتے ہیں بعض لوگ تو جیسی جیسی سامنے والے کی حالت ہوگی اس کے مطابق معاملہ ہوگا۔

شیخ محقق ہونا چاہیے

اسی لیے شیخ جو ہے وہ محقق ہونا چاہیے محقق تحقیق سے وہ حقے والا نہیں، ورنہ ایک شخص تھے بہت خوبصورت اور تھے جاہلِ مطلق، تو چار آدمیوں نے کہا کہ دیکھو تم کو کچھ آتا

باتا ہے نہیں، ہم آپ کو پیر بناتے ہے ہمارا بھی کام بنے گا اور تمہارا بھی اور حلوے مانڈے چلیں گے خوب، تو وہ تیار ہو گئے۔ وہ لوگ ایک بستی میں گئے وہ چار ان سے کہنے لگے کہ تم کچھ بولنا مت خاموش رہنا، چنانچہ انہوں نے بستی میں پہنچ کر یہ مشہور کر دیا کہ یہ بڑے حضرت ہے، حالانکہ ان کو یہ بھی نہیں آتا تھا کہ پیشاب آئے تو کہے کہ پیشاب آیا ہے یا قضاءِ حاجت کو جانا ہے، ان کو پیشاب آیا تو کہنے لگے کہ موتو لگی ہے، تو وہ چاروں نے کچھ دھیان نہیں دیا تو واقعتہ ان سے پیشاب ہو گیا کپڑے میں، تو لوگوں نے کہا کہ یہ کیسے پیر ہے ازار میں پیشاب کر دیا، تو یہ چاروں کہنے لگے کہ حضرت کا منشاء نہیں سمجھے تم حضرت یہ بتا رہے تھے کہ دنیائے فانی پر موتو اور پیشاب کرو، اور یہ بات حضرت نے ماشاء اللہ تم کو عملاً کر کے بتلائی کہ اس طرح دنیائے فانی پر پیشاب کیا جاتا ہے یہ ہے مطلب۔ اس راز کو آپ کیا سمجھیں گے، اب بتایئے اس کا کیا جوڑ ہے ادھر سے۔

حقیقتِ تصوف

اور صحیح بات یہ ہے کہ لوگوں نے تصوف کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ ایک پروفیسر سے میری بات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ میں تصوف کو نہیں مانتا، تو میں نے ان سے کہا کہ پہلے یہ تو بتاؤ کے تصوف کہتے کسے ہیں؟ اگر تصوف کا مطلب کونے میں بیٹھ کر چند تسبیح پڑھنا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں تو آپ تصوف ہی نہیں سمجھے، ذکر و تسبیحات وہ تو اس کے لیے معین ہے مقصود نہیں ہے، اور قیامت میں آپ سے سوال ہوگا تو نماز کی تکمیل کا سوال ہوگا، اس کے متعلق نہیں ہوگا، اگر ظہر سے عصر تک آپ تسبیحات میں مشغول رہیں تو یہ مستحب ہے اور یہ تکمیلِ فرائض کے لیے ہے، یہ سب باتیں سمجھانی پڑے گی۔ اور حق یہ ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے شیخِ محقق کی ضرورت ہے اور اسی لیے عارف کی دو رکعت یا منٹوں کا ذکر غیر عارف کی ہزاروں رکعت سے بھاری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو معرفتِ عرفان ہے، تو

کرتے رہے ذکر آدمی تو ذکر کرتے کرتے پھر ایک کیفیت پیدا ہوجائے گی، باقی اس زمانے میں جبکہ قوی کمزور ہے تو زیادہ کاوش کوشش ان چیزوں میں ہو اس کے بجائے فرائض، واجبات، حقوق کی ادائیگی ان چیزوں کو آدمی ادا کرے اور وہ مقاصد میں سے ہیں۔

(فیضِ ابرار ج۱۰، ص:۲۸۶)

اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ایک گھنٹہ ذکر کرلو اور ۲۳ رگھنٹہ آزاد رہو اس کو ہم نہیں مانتے، میں تو اس کو مانتا ہوں کہ نظر اٹھے تو حرام کی طرف نہ ہو، پیٹ میں کھانا جائے تو حرام نہ ہو، قرضہ لیا ہو تو واپس کرے، اسی طرح اور حقوق کا خیال رکھیں، کیونکہ شریعت اسی کا نام ہے، تو یہ ذکر و تسبیحات وغیرہ اس کے لیے معین ہے کہ اس سے قلب میں رقّت پیدا ہوگی نور پیدا ہوگا اور پھر یہ سارے کام کرنے اس کے لیے آسان ہوجائیں گے۔

اَوْراد و وظائف کی مثال

اس کو آپ ایک مثال سے سمجھ لیں کہ ایک آدمی دفتر گیا اور اس کو بہت سارے کام سونپ دئے گئے کہ یہ بھی کرنا ہے اور یہ بھی کرنا ہے اور یہ بھی کرنا ہے، مگر ان کاموں کے کرنے کے لیے طاقت چاہیے، اب اس کے لیے ایک شخص نے کہا کہ ہم آپ کو ایک جنزل ٹانک دیتے ہیں اس کو استعمال کریں آپ، اس نے وہ استعمال کرنا شروع کیا تو قوت آگئی اور اس کے لیے اب ان سب کاموں کو کرنا آسان ہوگیا، تو وہ جو اس نے جنزل ٹانک دیا ہے، بس یہی مثال شیخ کی طرف سے بتلائے ہوئے اوراد و وظائف کی ہے کہ وہ ایک جنزل ٹانک ہے اس کے استعمال کی وجہ سے قلب میں ایک نور پیدا ہوگا اور وہ نور اور محبت کی وجہ سے اس کے لیے سارے دین پر چلنا آسان بن جائے گا۔

ایک مزے دار بات

ذکر پر ایک مزے دار بات آپ کو سناؤں ،لوگوں میں جو یہ مشہور ہے نا کہ فلاں آدمی کو جنات نے پٹک دیا تو ایسے ہی ذاکرِ حقیقی کے پاس جب جن آتا ہے تو وہ پٹکی کھا جاتا ہے اور جن کہتے ہیں کہ اس کو فلاں انسان نے پٹک دیا، جنات کی دنیا میں بھی یہی بات ہوتی ہے کہ اس کو انسان لگ گیا، لہٰذا عامۃ الناس کے لیے یہی ہے کہ ان سے جتنا ہوسکے چلتے پھرتے ذکر کریں، یہ ذکر جو ہے قلب تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوگا، باقی اس کا طریقہ کیا ہو تو وہ کسی محقق شیخ سے تعلق پیدا کر کے پھر معلوم کیا جاسکتا ہے۔

فرائض کی ادائیگی مقدم ہے

لیکن یہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی بہت ضروری ہے (معارفِ بہلوی ج ۳، ص: ۴۶۰) اگر نمازیں پچھلی باقی ہیں تو چاہے کتنے مراقبے کرتے رہو اس سے ترقی نہیں ہوگی، کیفیت ہو جائے اور چیز ہے، اگر کسی کو کشف ہوتا ہے تو کشف تو جوگی کو بھی ہوتا ہے، کیونکہ کشف تو نفس کی صفائی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کشف تو کتے کو بھی ہوتا ہے کتوں کو احساس کتنا ہوتا ہے چوروں کو پکڑنے کے لیے اس کو استعمال نہیں کرتے تو کشف مقصود نہیں ہے، مقصود تو قبولیت ہے عند اللہ۔

(حوالہ بالا ص: ۱۵۰)

دیکھو! ایک ہے ریاضت اور اس کے ذریعہ سے کوئی خاص کیفیت۔ ہمارے چچا راجپوتا میں پہنچے وہاں راجا کی طرف سے سادھوؤں کے لیے کھانے کا بندوبست تھا، تو ایک سادھو تھا جو بارہ سال سے درخت کی ایک شاخ پر رام رام کرتا رہتا تھا، ہمارے چچا نے اس سے پوچھا کہ کیا پایا، تو اس نے کہا کہ جاؤ بات مت کرو، اور کھانے کے ٹائم میں کچھ آتا تھا تو اس کو فوراً کھا لیتا تھا۔

فضائلِ ذکر وغیرہ میں حضرت شیخ رحمہ اللہ نے واقعات لکھے ہیں نا کہ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ جتنی دیر کھانے میں لگتی ہے اتنے اوقات میں میں قرآنِ کریم کی پچھتر (۷۵) آیتیں پڑھ سکتا ہوں، اس لیے صرف ستو پھانک لیتا ہوں (فضائلِ ذکر ص ۳۵)، تو اسی طرح یہ سادھو بھی معمولی سا کھالیتا اور وہیں ندی کے کنارے پر پانی میں نہالیتا اور وہیں پانی سے استنجاء کرلیتا تو اس طرح اس نے بارہ سال گذارے۔ ہمارے چچا فرماتے تھے کہ اگر وہ بارہ سال اسمِ ذات کا وظیفہ کرتا تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ،تو اس نے ایسا بارہ سال تک کیا۔

حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے کہ عشاء بعد ذکر بالجہر شروع کرتے تھے اور فجر کی اذان کے ٹائم ختم کرتے تھے (حکایاتِ اولیاء، ص: ۲۱۹)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جس کا ذکر اتنا طویل ہو اس کے احوال اور کیفیات کا کیا حال ہوگا، مگر یہ سب ہمارے بس کا نہیں ہے۔ بعض لوگ جذبہ میں شروع کر دیتے ہیں اور بعد میں وہ پاگل ہو جاتے ہیں، لوگوں کو پتھر مارتے ہیں پھر لوگ سلوک کو بدنام کرتے ہے، حالانکہ یہ ان کی جہالت کی وجہ سے ہے (فیضِ ابرار، ج ۱۰، ص: ۲۸۷) اسی لیے اس میں شیخ آدمی کا حال دیکھے گا اس کی قوت دیکھے گا، ورنہ ایسے ہی کرتا رہے گا تو دماغ پھٹک جائے گا اور ظاہر ہے اس سے تو تصوف گندہ ہوگا۔

لوگوں کا ایک غلط فیصلہ

اسی لیے ایک بات سن لیں ، لوگوں نے ایک غلط فیصلہ کررکھا ہے خاص طور سے ہمارا گجرات کا جو طبقہ ہے اس نے وہ جب کسی کی تعریف کرتے ہیں تو کیا کہتے ہیں معلوم؟ کہ فلاں بہت اللہ والا آدمی ہے اس کو تو دنیا کی کچھ پڑی ہی نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ انبیائے کرام علیہم السلام کو تو سارے عالم کی پڑی تھی یہ تو احمقوں کی دنیا ہے کہ اس کو کچھ پڑی نہ ہو۔ ہاں! اگر کوئی مجذوب ہے تو وہ مجبور ہے معذور ہے اس کی ملامت بھی نہیں کی

جائے گی ، مگر اس کا اقتداء بھی نہیں ہوگا۔''جلبانیہ''ایم ، پی میں ایک جگہ ہے وہاں ایک مجذوب تھے وہ پینتالیس سال سے ایک جونپڑی میں رہتے تھے ان کی خوارک کیا تھی؟ کسی نے چائے دی تو چائے پی لی پان دیا تو پان کھا لیا، لیکن وہ مجذوبِ محض تھے، سلوک میں ان کی ترقی نہیں ہوئی، اصل میں جذب کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اختیاری اعمالِ شرعی کرتا رہتا ہے، اور جذب کے معنی آتا ہے کھینچنا جاذب کو جاذب اسی لیے کہتے ہے کہ وہ روشنائی کو کھینچتا ہے، تو قلب پر ادھر سے ایک شے وارد ہوتی ہے اس کو کہیں سکینہ سے تعبیر کیا، کہیں کسی اور نام سے، بس ادھر کی جو لذتیں فرحتیں ہوتی ہیں وہ آدمی کو کھینچتی ہیں اور ادھر کی جو لذتیں ہوتی ہیں اس کے سامنے ساری دنیا کی لذتیں ہیچ ہیں۔

اچھا! اب وہ جو شکل ہوتی ہے اس میں استغراق ہو جاتا ہے ایک خاص قسم کا نشہ ہوتا ہے ایک خاص قسم کی کیفیت ہوتی ہے معنوی، مگر انسان مکلّف ہے اعمال کا اور اعمال کرتا رہا تو ترقی ہوگی، یہ عمل جو ہے سلوک ہے، چلنا ہے۔

دو طبقے:

اسی لیے اس میں دو طبقے ہیں: ایک مجذوب السالک، اور دوسرا السالک المجذوب۔ المجذوب السالک کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کہ اپنے محل میں سوئے ہوئے تھے کہ چھت کے اوپر کسی کے چلنے کی آواز سنی، پوچھا کون؟ اور یہاں اس وقت کیوں؟ تو اس نے کہا کہ میں اپنا اونٹ تلاش کر رہا ہوں وہ غیبی جذب تھا، تو ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کا تو یہاں ملنا ممکن نہیں کہ آپ اس کو یہاں تلاش کر رہے ہو یہ تو بے وقوفی ہے، تو اس نے کہا کہ تمہیں ان جھمیلوں میں رہ کر ادھر آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا جو شوق ہے یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ بس! اس کا سننا تھا کہ دل میں ایک آگ لگی اور ملک چھوڑ کر چل دئے (تذکرۂ مشائخِ چشت، ص: ۱۳۸) اور صاحبِ کرامت ہوئے ہیں، سوئی والا واقعہ مشہور ہے ان کا۔ اچھا تو ایک شکل یہ ہے جذب کی۔

اور دوسری شکل ہے سلوک کی کہ چلتا رہے آدمی اور چلتے چلتے جذب ہو، اس کی مثال ایسی ہے کہ باپ اپنے بچے کو سامنے کھڑا کردے اور کہے کہ بیٹا یہاں آؤ، اب وہ ایک دوقدم اٹھاتا ہے اور گرنے کے قریب ہوتا ہے تو باپ لپک کر اس کو خود اٹھا لیتا ہے (خطباتِ حکیم الاسلام ج۸، ص: ۲۱۲) تو سلوک ایسا ہے جیسے آپ سیڑھی سے چڑھے اور جذب ایسا ہے جیسے آپ لِفٹ سے چڑھے۔

لطیفہ

اب ایک لطیفہ بھی سن لیں بیچ میں، ایک صاحب دیہات کے شہر میں گئے اس نے دیکھا کہ لِفٹ پر ایک بڑھیا چڑھی اس کے بعد وہ کسی منزلہ پر اتر گئی ہوگی، اور وہاں سے کوئی جوان لڑکی چڑھی اور وہ نیچے اتری، تو وہ کہنے لگے کہ اوہو شہر نے بڑی ترقی کی کہ بوڑھی چڑھتی ہے اور جوان ہوکر اترتی ہے، تو اس کی بیوی بھی بوڑھی تھی تو وہ اس کو کہنے لگے کہ چال تو بھی اوے آپڑے بھی اوپر جائے نے نیچے اترے (چل ہم بھی اوپر جاکر نیچے اترے) وہ سمجھا کہ بوڑھاپے میں جوان ہونے کا علاج یہ ہے۔ تو خیر! عام لوگوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ذکر واستغفار کرتے رہیں اور کسی محقق شیخ سے رجوع کریں، ورنہ اپنے شوق میں بہت زیادہ کرلے گا تو اس کی وجہ سے دماغ میں خشکی ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے پھر نیند پر بھی اور صحت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اور اسلام ایسا دین ہے کہ اس نے سارے پہلوؤں کا لحاظ کیا ہے، اور شیخ محقق ہوگا تو وہ سب کچھ دیکھے گا وہ آپ کی صحت کو بھی دیکھے گا کہ آپ کتنے ذکر کا تحمل کر سکتے ہیں، جیسے غذا ہے اگر کسی کمزور آدمی کو کہا جائے کہ تم دوکلو دودھ اور مالائی اور اتنی بادام روزانہ کھایا کرو تو وہ تو بے چارہ ختم ہو جائے گا، تو ساری چیزوں کی رعایت ہوگی کہ آپ کام پر جاتے ہیں، کیا کام کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی صحت کو بھی دیکھے گا، پھر ذکر کی مقدار بتائے گا اگر وہ شیخ محقق ہوگا تو، اور اگر وہ ایسے ہی لے بھاگو ہے تو پھر ایسے ہی لوگوں نے اس فن کو بدنام کیا ہے۔

اسی لیے صحیح اور سچے قسم کے صوفیاء سے ہر زمانے میں اسلام کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور پیٹ پرستوں سے ہر زمانہ میں بہت نقصان پہنچا ہے۔ بس! آج اسی پر مجلس ختم کریں، باقی باتیں پھر کل ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مجلس نمبر (۲)

ہر چیز کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس نمبر (۲)

ہر چیز کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے

ایک ہے کسی چیز کی صورت اور ایک ہے اس کی حقیقت ،اورصورت جو ہے وہ حقیقت کے حق میں محافظ ہوتی ہے اور حقیقت جو ہے وہ صورت کی بقاء کا سبب بنتی ہے۔ اس کو آپ ایسے سمجھ لیں ، مثلاً گلاب کا پھول ہے اس کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے خوشبو جو اندر ہوتی ہے ، تو گلاب کی جو خوشبو ہے اس کا جب ظہور ہوگا تو وہ اپنی مناسب صورت میں ہوگا چمیلی کی صورت میں نہیں ہوگا، کیوڑے کے پتی کی شکل میں اس کا ظہور نہیں ہوگا، کیونکہ ہر حقیقت اپنے مناسب صورت ڈھونڈتی ہے ،تو دو چیزیں ہوگئیں ایک یہ کہ حقیقت صورت کے لیے بقاء کا سبب ہے اور صورت حقیقت کی محافظ ہے، حقیقت کی ترجمانی صورت سے ہوتی ہے، اس کو آپ ایسے سمجھ لیں جیسے میوزیم میں آپ نے شیر کی صورت بنی ہوئی دیکھی ہوگی اس کا مجسمہ ،تو وہ صورتِ شیر ہے ، مگر اس کی حقیقت اس میں موجود نہیں ہے ، تو ہر شئی کی ایک حقیقت ہے اور ایک صورت ہے اور تقریباً یہ ہر شئی میں ہے، جیسے نماز کی ایک صورت ہے قیام ، رکوع ،سجدہ وغیرہ اور نماز کی ایک حقیقت ہے وہ ہے رجوع الی اللہ۔تو ہر شئی کے اندر تقریباً تقریباً یہی عمل ہے ۔

یہ عالم جو ہے وہ صورتوں کا عالم ہے اور اس عالم میں حقیقتیں صورتوں کی حالت میں ظاہر ہوتی ہیں ، جیسے میں نے مثال دی کہ گلاب کی حقیقت گلاب کے پھول کی شکل میں ظاہر ہوگی اور کیوڑے کی جو حقیقت ہے وہ کیوڑے کے پھول کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور انسانی حقیقت انسان کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے،تو غرض یہ کہ ہر شئی کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے، یہ موٹی سی بات ہے اس کو سمجھنا کوئی دشوار نہیں ۔

اب یہاں یہ سمجھنا ہے کہ ایک ہے کعبۃ اللہ کی صورت اور ایک ہے اس کی حقیقت اوراس پر صوفیاء اور محققین نے بڑی دقیق دقیق بحثیں کی ہیں۔

میں سادہ انداز میں اس کو ذہن سے قریب کرنے کی کوشش کروں گا خدا کرے کہ سمجھ میں آئے، تو کعبۃ اللہ کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے(اشرف الجواب) اور نبی کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے اور نماز کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے اور عوالم کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے، اور عوالم عالم کی جمع ہے۔ دنیا کی بھی ایک صورت ہے ایک حقیقت ہے برزخ کی بھی ایک صورت ہے ایک حقیقت ہے اور آخرت کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے، یہ سلسلہ گویا ہر شئی میں ہے۔ میں اس کو مثالوں سے اس لیے بار بار ریپیٹ کررہاہوں کہ آگے جو بولنا چاہتا ہوں اس کے لیے اس کو نہیں سمجھا تو آگے تارے دکھیں گے، چونکہ وہ دقیق مضمون ہے اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ سات آسمان ہیں اور سات زمین ہیں تو یہ چودہ منزلہ بلڈنگ ہیں ،اور آسمانوں میں بھی کعبہ ہے جس کا نام بیت المعمور ہے اور حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے بموجب ہر آسمان میں بیت المعمور کی ایک نظیر موجود ہے تو ساتویں آسمان میں بیت المعمور ہے اور وہ ملائکہ کا قبلہ ہے۔ (خطباتِ حکیم الاسلام، ج ۳) اور جس طرح دنیا میں کعبۃ اللہ کا طواف ہوتا ہے اسی طرح ملائکہ بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ ۷۰ ہزار فرشتے روزانہ اس کا طواف کرتے ہیں اور جو ایک مرتبہ طواف کرتے ہیں پھر دوبارہ ان کی باری نہیں آتی (صحیحین) ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ﴾(سورۂ مدثر آیت نمبر۳۱) اور ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کی بیچ کی تلّی بقول مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ وہ بیت اللہ ہے کہ اگر ساتویں آسمان سے بیت المعمور سے رسی چھوڑی جائے تو وہ ٹھیک بیت اللہ پر گرے گی (سیرت المصطفی، ج ۱) اور زمین سے لے کر آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۱، ص: ۲۹۲) یہ لوگ

تو ابھی ستاروں ہی کی دنیا میں گم ہے۔ اچھا! اس کے بعد آسمانوں کا جوڈل ہے ﴿ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰهَا ﴾(سورۂ نازعات، آیت نمبر: ۲۷) وہ خود پانچ سو سال کی مسافت ہے اور یہی سلسلہ ساتوں آسمانوں میں ہے، تو ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے اور وہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے کہ اس سے آپ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے جیسا کہ معراج کے واقعہ میں حضور ﷺ نے دیکھا(صحیحین) اوراس میں ایک نکتہ یہ نکلا کہ یہاں پر وہ بیت اللہ کی تعمیر کے لیے کھڑے ہوئے تو گویا وہاں پر اسی چیز سے ٹیک نصیب ہوا (خطبات حکیم الاسلام ج۴، ص: ۴۶۶) تو یہاں آدمی جس عمل کے لیے مشقت اٹھائے گا وہی عمل اس کے لیے وہاں راحت اور ٹیک کا سبب بنے گا، جیسے وہ بیت المعمور سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، تو یہ گویا بیچ کی تلی کی طرح ہے۔

چار عظیم ترین شعائر

اور قیامت جب قائم ہوگی تو اس سے پہلے پہلے نبوت تو ختم ہوچکی، آپ ﷺ تو تشریف لے گئے دنیا سے، او چار شعائرِ اعظم ہیں: کتاب اللہ، کعبۃ اللہ، رسول اللہ ﷺ اور نماز۔

(رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ ج۱، ص: ۷۰۹)

اور شعار کہتے ہیں کسی مذہب کی کوئی مخصوص اور امتیازی چیز کو (خطباتِ حکیم الامت ج۶، ص: ۲۱۳) تو چار بڑے شعائر ہیں: (۱) کتاب اللہ (۲) کعبۃ اللہ (۳) رسول اللہ ﷺ اور نمبر (۴) نماز۔ اور قرآنِ کریم میں بھی یہی ترتیب ہے، تو یہ چار عظیم ترین شعائر کا تذکرہ ہے۔

اب اس میں کیفیت یہ ہے کہ پیغمبر تو جاچکے اور قیامت سے پہلے پہلے قرآنِ کریم کو لوگ کھولیں گے تو دیکھیں گے حروف اس میں سے غائب ہے(اخبارِ مکہ) اور یہی حال دلوں کا بھی ہوگا، تو سینوں سے بھی غائب اور سفینوں سے بھی غائب، تو کتاب اللہ رخصت، رسول اللہ ﷺ تشریف لے جاچکے، اور نماز کے بارے میں آپ نے تعلیم میں حدیث

شریف سنی ہوگی کہ قیامت سے پہلے نماز کا خشوع اٹھالیا جائے گا کہ بھری مسجد ہوگی ،مگر کوئی خاشع نظر نہیں آئے گا (جامع الصغیر) تواس کی روح بھی رخصت ،اب رہ جاتا ہے کعبۃ اللہ تو حدیث شریف میں ہے کہ ایک ادنیٰ درجہ کا حبشی جس کی پنڈلیاں چھوٹی چھوٹی اور پھر ٹیڑھی یعنی ناگوار حالت والا وہ کعبۃ اللہ کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا(فضائلِ حج)۔ اچھا !اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ بتلانا ہے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی سلطنت اور بڑی سے بڑی طاقت اپنے بل بوتے پر کعبۃ اللہ کو ختم نہیں کرسکے گی۔اورحضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اس کی مثال دی ہے کہ ایک بادشاہ ہے اس کا جو محلِ شاہی ہوتا ہے اس پر آنچ آئے تو اس صورت میں پوری کی پوری ملٹری حرکت میں آجاتی ہے اور سامنے والے کی آبنتی ہے، کیونکہ بادشاہ اس کی حفاظت چاہتا ہے،تو بیت اللہ کی جب حفاظت منظور تھی تو ابرہہ جب بیت اللہ کو ڈھادینے کے ارادہ سے آیا تو ابابیل کے لشکر کے ذریعہ بمباٹ کرکے رکھ دیا(سورۂ فیل)۔اور جب حق تعالیٰ کو منظور ہوگا کہ اس کو ڈھا دیا جائے تو حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بادشاہ جب کسی ملک میں اپنا خیمہ لگائے اور اس کو ختم کروانا چاہتا ہے تو معمولی سے مزدور کے ہاتھوں اس کو تو ڑوا دیتا ہے،تو اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے اس کو منہدم کرانا ہے تو معمولی سے حبشی کے ذریعہ سے اس کو منہدم کرادیں گے(خطباتِ حکیم الاسلام ج۴ ،ص: ۴۳۹)۔اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ کی خود مشیت یہ ہے کہ کعبۃ اللہ کی عمارت منہدم ہوجائے اس کی صورت منہدم ہوجائے جس سے اس کی حقیقت پر زد پڑے گی کہ وہ صورت نہیں رہے گی پھر۔

صحابۂ کرام کے درمیان جنگ کی ایک حکمت

یہاں ایک نکتہ سن لیں بیچ میں کہ صحابۂ کرام کے درمیان جو جنگیں ہوئی ہیں صفین اور جمل وغیرہ ،اس میں ایک حکمت یہ تھی کہ یہ صحابہ اگر ایسے ہی راج کرتے تو حضرت عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا ایک اور پیدا ہوجاتا تو پھر دنیا میں ایک کافر بھی نہ ملتا اور صحابہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھیں تو اللہ تعالیٰ کی غیرت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ کے تربیت یافتہ کو غیروں کے ہاتھوں سے تڑواتے ہوئے غیرت آتی تھی، اس لیے آپس میں طاقت کمزور ہوئی ہے، ورنہ مجال نہیں تھی کہ " إن الذین کفروا " صحابہ کی طاقت کو کمزور کرتے، اور پتہ نہیں یہ دھوتی پرساد کہاں بھاگتے پھرتے۔

ہجرتِ مدینہ کا ایک نکتہ

اسی طرح آپ ﷺ کی ہجرتِ مدینہ میں یہ نکتہ لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے جو ہجرت فرمائیں تو اس میں ایک حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ توحیدی کا مرکز تو مکہ تھا ہی اگر مکہ مکرمہ میں حضور ﷺ کا مزارِ مبارک بھی رہتا تو خالق کی حیثیت سے جو اللہ تعالی کا گھر مرجع ہے اگر آپ ﷺ کا مزارِ مبارک بھی مکہ مکرمہ میں ہوتا تو مکہ مکرمہ میں دو جہتوں سے محبوبیت ہوجاتی اور دونوں جہتوں سے ہجوم ہوتا، لہٰذا اس کا تقاضہ یہ ہوا کہ حضور ﷺ سے ہجرت کروائی گئی (فیضِ ابرار، ج۵، ص:۲۵۱) یہ سب عرفانی باتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اندازہ

تو ایک ہے کعبۃ اللہ کی صورت اور ایک ہے حقیقت اور یہ صورت اس لیے رکھی گئی ہے کہ عبادت کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عابد کے سامنے معبود ہو (اشرف الجواب) اور یہاں ہمارے معبود وہ ہیں کہ بقولِ شخصے ؎

ارض وسماں کہاں تیری وسعت کو پا سکے	☆	میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آسمان وزمین مجھ کو سما نہیں سکتے، بلکہ وہ تو ایک پل میں ختم ہوجائے اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، ساتوں آسمان وزمین کرسی کے مقابلے میں ایسے

ہیں جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھلہ ڈال دیا جائے (خطباتِ حکیم الاسلام ج۱، ص: ۲۹۹) اور کرسی عرش کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے میدان میں کوئی چھلہ پڑا ہو۔ اور علماء لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مقابلے میں یہ عرش نمک کی ڈلی کے برابر ہے، اب آپ اندازہ لگایئے اللہ تعالیٰ کتنے بڑے ہوں گے۔ اور امام رازی رحمہ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں سورۂ یونس کی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش سرخ یاقوت کا ہے۔

حقیقتِ کعبہ

بات دوسری طرف چلی گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو کعبۃ اللہ ہے اس کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے اور حقیقتِ کعبہ کے باب میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حقیقتِ کعبہ یہ اینٹ، پتھر کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ تو نور کی تجلی ہے صوفیاء اس کو تجلیٔ بے کیف کہتے ہیں (اشرف الجواب) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی کیفیت انسانوں کی نظر میں نہیں ہے، کیونکہ اس میں کوئی کیفیت ہی نہیں ہے۔ کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ سفید ہے اور یہ کالا ہے اور یہ نرم ہے اور یہ گرم ہے، تو اس کی کیفیت ہی بیان نہیں کی جاسکتی، سمجھ میں آیا بے کیف کا مطلب؟ بے لطف نہیں ہے، بلکہ یہ کہ انسان اس کو کسی حد میں نہیں لاسکتا ہے اور اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا ہے وہ سب سے وراء الوریٰ ہے اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ لال ہے یا پیلا ہے یا نرم ہے یا گرم ہے۔ بس! اسی کا نام بے کیف ہے، تو بیت اللہ جو ہے خانۂ خدا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوتی ہے۔

جب آپ اس حقیقت کو سمجھ گئے تو آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب ایک مسلمان نماز پڑھتا ہے تو نیت کیا کرتا ہے کہ مثلاً میں ظہر کی چار رکعت فرض نماز پڑھتا ہوں، کس کے لیے؟ اللہ تعالیٰ کے لیے، منہ کس کی طرف؟ کعبہ کی طرف، تو وہاں منہ کعبہ کی طرف ہے، عبادت کس کے لیے ہے؟ اللہ تعالیٰ کے لیے (اشرف الجواب، ص: ۱۷) بعض علاقوں

میں شادی ہوتی ہے تو دُلہے سے دو رکعت نماز پڑھاتے ہیں تو ایک صاحب کہنے لگے کہ دُلہے کی نیت یہ ہوتی ہے کہ دو رکعت نماز پڑھتا ہوں دلہن کے واسطے، منھ میرا سسرال کی طرف۔ اچھا! یہ جو بیت اللہ شریف ہے اس کے لیے کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ اگر بالفرض یہ منہدم کر دیا جائے جب بھی نماز فرض رہے گی اور اس کی طرف منھ کیا جائے گا جہاں کعبہ موجود ہے (اشرف الجواب، ص:۱۷) تو وہ اینٹ، پتھر مقصود نہیں ہے، کیونکہ کعبۃ اللہ تو تجلیٔ بے کیف کا مقام ہے، تو معلوم ہوا کہ اینٹ، پتھر کا نام کعبۃ اللہ نہیں ہے، لہٰذا ہم کفار کو ان کے اشکال کے جواب میں یہ کہیں گے کہ جیسا کہ ایک نے کہا تھا کہ محمد صاحب تو پتھر کی عبادت کرواتے ہیں، اس گدھے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو صرف کعبہ کے سامنے ہی نماز ہوتی اور یہاں تو اگر کوئی شخص سقفِ کعبہ پر نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے (حوالہ بالا) وہ تو صرف ایک جہت ہے اسی لیے آپ نے ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ "جعلت لي الأرض مسجداً وطهوراً" (بخاری شریف) بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی یہ نیت کرے کہ میں کعبہ کی عبادت کرتا ہوں تو کفر ہو جائے گا، کیونکہ کعبہ کی عبادت نہیں ہوتی اس کی طرف رخ ہوتا ہے، کعبہ معبود نہیں ہے وہ تو ایک پتھر ہے۔ ہاں! اصل جو رخ ہے وہ اس صورتِ کعبہ کے توسط سے حقیقتِ کعبہ کی طرف ہے اور حقیقتِ کعبہ تجلیٔ بے کیف ہے۔ اس کو آپ ایک مثال سے سمجھ لیں جیسے ایک ٹیوب لائٹ ہے اس کو آپ دن میں اپنی جگہ سے نکال لیں تو ظاہر بات ہے کہ خالی صورت سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اس میں جو ایک خاص تجلی ہے، یعنی روشنی وہ اصل حقیقت ہے یہ صورت اس کے لیے سمجھئے ظہور کی ایک جگہ ہو گئی ہے، ورنہ فی حد ذاتہ وہ حقیقت اس پر موقوف نہیں ہے، بلکہ دوسروں کے واسطے اس میں سہولت ہے کہ اس شکل کے واسطے سے اسے حاصل کرے، تو تجلیٔ بے کیف کا ادراک لوگوں کو نہیں ہوتا، اس سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ بعض بزرگوں کے واقعات میں جو یہ ملتا

ہے کہ وہ بیت اللہ کے پاس گئے تو دیکھا کہ بیت اللہ غائب ہے اور بیت اللہ فلاں بزرگ کے استقبال کے لیے گیا تو بیت اللہ تو اپنی جگہ پر ہے، وہ منشاء ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک خاص التفات ہے اس کی ترجمانی ہے، یہ نہیں کہ بیت اللہ وہاں سے چلا گیا، لہٰذا اس کی طرف رخ کرنے میں اصل منشاء وہی ہے کہ چونکہ وہ تجلیٔ بے کیف کا مقام ہے اس کی وجہ سے وہ قابلِ تکریم ہے اور وہ اس کے لیے مکانِ خاص کردیا گیا ہے، ورنہ فی حدّ ذاتہ تجلی بھی اس میں منحصر نہیں ہے اور اس کا ثمرہ وہاں ظاہر ہوگا کہ ﴿أَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهُ﴾ (سورۂ بقرۃ، آیت نمبر: ۱۵) اگر چہ یہ حالتِ اضطرار کی شکل ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص بیت اللہ کو منہدم کردے مسمار کردے تب بھی ادھر رخ ہوگا۔ اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ بیت المقدس اور بیت اللہ میں جتنی مسافت ہے وہ درحقیقت بِنا کے اعتبار سے بھی ۴۰؍سال کا فاصلہ ہے، یعنی بناءِ آدم (الخیر الجاری شرحِ بخاری ج ۴، ص: ۶۸، ۶۹) ورنہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام والا اس میں تو ایک ہزار سال سے بھی زائد کا فاصلہ ہے (حوالہ بالا ص ۶۹) اور یہ دونوں جتنے فاصلے پر ہیں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے تو اس کی بھی حکمت لکھی ہے کہ اتنے ہی فاصلے پر ہونا چاہیے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بیت المقدس کی جو شکل ہے وہ گویا اللہ کی صفتِ عدل کا ایک ظہور ہے جس کو عدالتِ عامہ سے تعبیر کرنا چاہیے اور یہ کعبۃ اللہ عدالتِ خاصہ ہے۔

میں جس زمانہ میں ڈابھیل میں پڑھتا تھا اس زمانہ میں یہودیوں نے بیت المقدس میں آگ لگائی تھی، تو دار الحدیث میں جلسہ ہوا اس میں سب اساتذہ وطلباء اور کچھ گاؤں کے لوگ بھی تھے اور مجھ کو اس میں کچھ بولنے کا موقعہ ملا، میرے لیے یہ ایک شرف تھا، میں نے ''قبلہ نما'' حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی دیکھ رکھی تھی پہلے سے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اس میں لکھا تھا کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص جو ہے اس مظہرِ عدالت یعنی اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا جو ظہور ہے بیت المقدس ایک خاص جہت سے یہ دیوانِ عام کی

حیثیت رکھتا ہے اس کو کوئی جلائے تو اس کا تو امکان ہے، مگر اس دیوانِ خاص پر یعنی کعبۃ اللہ پر جب اثر پڑے گا تو عالم میں ہنگامہ ہو جائے گا۔ ہاں! ایک شکل یہ ہے کہ اس پر زد پڑ جائے، جیسے مثلاً کوئی آدمی عمارت کا کوئی حصہ منہدم کر دے یا اس کی تعمیر مقصود ہو یا یہ کہ آپس میں جنگ ہو اور اس پر زد پڑے جیسا کہ بعض واقعات میں ہوا بھی ہے (تاریخ مکۃ المکرّمۃ) وہ اور شکل ہے، مگر اس کا مکمل انہدام جو ہے نا قابلِ برداشت ہے۔

اب آپ دیکھئے اس وقت ایٹمی، فضائی، سائنسی، ہر اعتبارات سے غیروں کے سامنے سعودیہ کی کیا حیثیت ہے؟ کوئی حیثیت ہے اس کی کچھ بھی نہیں اگر چہ ان کی دولت سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، لیکن ظاہری قوتیں تو کچھ بھی نہیں ہیں ان کے پاس، تو وہ لوگ اس کو منہدم کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، مگر اس کا تحقق نہیں ہوگا کبھی بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے محافظ ہیں۔ اچھا! دوسری بات یہ ہے کہ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو بیت اللہ اینٹ اور پتھر کا نام نہیں ہے۔

یہ تمکین کی طرف اشارہ ہے

ہمارے مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم نے ایک دن کسی کتاب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی جو ہے وہ سیاہ ہے، تو یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ اصل میں یوں نہیں ہے، بلکہ جتنے رنگ ہیں، کلرس ہیں، ان تمام رنگوں کے ختم ہونے پر ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اس کو رنگ سے تعبیر نہیں کر سکتے تو وہاں بعض لوگ لکھ دیتے ہیں سیاہ، حالانکہ وہ سیاہ بھی نہیں ہے حقیقۃً نہیں سمجھ میں آیا آپ کی؟ اصل میں شاہ عبدالرحیم صاحب ولائتی رحمہ اللہ ایک بزرگ تھے اور سید احمد بریلوی رحمہ اللہ ایک بزرگ تھے تو مشائخین نے دیکھا کہ شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ کی جو نسبت ہے اس کے انوار بہت دکھے، مگر سید احمد

بریلوی رحمہ اللہ کی نسبت میں انوار نہیں دکھے (حکایاتِ اولیاء، ص:۱۲۳) تو لوگ کہنے لگے کہ شاہ عبد الرحیم صاحب رحمہ اللہ سے ان کی نسبت بڑی ہے۔حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ مشائخ کے فیصلے میں غلطی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں انوار ہے وہ ظہور کا درجہ ہے اور سید صاحب مراتبِ ظہور کو ختم کر کے آگے پہنچے ہوئے تھے کہ جہاں پر کوئی رنگ ہی نظر نہیں آ رہا ہے، کچھ پلّے پڑ رہا ہے آپ لوگوں کے؟ اچھا! جب یہ انوار اور کلرس ہوتے ہیں اس لیے انوار کی بھی قسمیں لکھی ہیں، تو یہ جہاں ختم ہوتے ہیں اس کی تعبیر و تفہیم کے لیے وہاں کہہ دیتے ہیں کہ کوئی لون نہیں ہے کوئی کلر نہیں ہے تو بس ایسا جیسا تاریک معلوم ہوتا ہے، تو اس کو سیاہ سے موسوم کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ حقیقۃً سیاہ نہیں ہے۔تو میں نے کہا کہ یہی وہ گہری حقیقت ہے کہ بیت اللہ کے لیے غلاف کا جو کلر تجویز کیا گیا وہ سیاہ کیا گیا ہے کہ سیاہ رنگ پر کوئی رنگ نہیں آتا اور یہ تمکین اور استقامت کی طرف اشارہ ہے (فیضِ ابرار، ج۵، ص: ۳۲۵) تمکین، نمکین نہیں۔تمکین یعنی ایسی کیفیت جو اور رنگ کو اپنے اندر نہ لے سکے۔ یہ مضمون آپ کو دقیق معلوم ہو رہا ہوگا۔

حقیقتِ کعبہ حقیقتِ محمدیہ سے بڑھ کر ہے

تو بہر حال یہ کہ بیت اللہ کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے اور مجدد صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حقیقتِ محمدیہ سے حقیقتِ کعبہ بڑھ کر ہے اور وجہ اس کی یہ لکھی ہے کہ حضور ﷺ جو ہے خود اس کی طرف متوجہ تھے وہاں حقیقت سے پتھر مراد نہیں ہے، بلکہ وہ تجلی مراد ہے۔ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا (اتحاف ج۱، ص:۴۵۳) اور ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا (ترمذی) اور ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا (مصنف عبد الرزاق) تو یہاں ان سب سے مراد حقیقتِ محمدیہ

ہے۔ حقیقۃ الحقائق جو ہے وہ حقیقتِ محمد یہ کہلاتی ہے کہ جو کائنات کے وجود کا سبب ہے، یہ اصل میں متکلمانہ اور متصوفانہ مسئلہ ہے اور ہے بہت دقیق اور سمجھانا ہے مشکل تو وہ جو کیفیاتِ ظہوری ہے اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔

موت کی حالت وصال کی ہے

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک تو ہے بندہ اور ایک ہے رب اور بیچ کی کڑی جو ہے وہ واسطہ بنتی ہے، تو حقیقۃً وہ کعبہ کو واسطہ قرار دے رہے ہیں، جیسے صلوٰۃ کے ذریعہ سے جو قرب نصیب ہوتا ہے تو صلوٰۃ (نماز) جو ہے تمام طاعتوں کی جامع ہے کہ اس سے جو قرب نصیب ہوگا وہ تمام طاعتوں سے زیادہ قرب ہوگا، اس قرب کا ظہور جو ہے وہ ہو رہا ہے موت کے وقت، اس لیے فرماتے ہیں کہ موت کی حالت اس سے بڑھ کر ہے اس لیے کہ موت کی حالت وصال کی ہے اور صلوٰۃ وصال ہی کی ترجمانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صلوٰۃ کی نہایت سلام ہے اور سلام جو ہے آپ کہیں جا رہے ہیں غائب ہو رہے ہیں اس وقت کرتے ہیں، اور کہیں سے واپس آئیں گے تب کریں گے، تو معلوم ہوا کہ اس کے آگے پیچھے غائب ہونے کا مفہوم ہے، اسی لیے مُصلِّی اپنی نماز ختم کرتا ہے سلام پر، جس میں ادھر اشارہ ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بدن سے تو میں تمہارے درمیان تھا، مگر اپنی روح سے مجھے معراج نصیب ہوئی تھی، اب میں وہاں سے آ رہا ہوں، اس لیے کہہ رہا ہوں ” السلام علیکم ورحمة الله “، تو یہ سلام جو ہے وہ اپنی حقیقتِ معنویہ سے غائب ہونے کی طرف لطیف اشارہ ہے، ورنہ آپ بیٹھے بیٹھے السلام علیکم کہتے رہیں تو لوگ کہیں گے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے کیا۔

تو معلوم ہوا کہ سلام کی ابتداء یا انتہاء میں غائب ہونے کا مفہوم ہونا چاہیے، تو نماز کے اختتام پر جو سلام ہے اس میں غیبوبت کی طرف اشارہ ہے اور وہ غیبوبت کونسی کہ گویا

روح سے اسے عروج نصیب ہوا، لہٰذا موت کی حالت میں اس اعتبار سے کہ وہ وصال کا وقت ہے اور وہ تمام طاعتوں سے جو قرب نصیب ہوتا ہے اس سے وہ اعلیٰ ہے، اور برزخ میں اور قرب نصیب ہوگا کہ برزخ جو ہے وہ دنیا اور آخرت کے درمیان واسطہ ہے آخرت میں اور زیادہ قرب ہوگا اور جنت میں جا کے اور زیادہ قرب اور نزدیکی حاصل ہوگی۔

جنت کے بھی اقسام ہیں

اور پھر جنت کے اندر اور زیادہ قرب نصیب ہوگا اور جنت کے بھی اقسام ہیں۔ شیخ محی الدین ابنِ عربی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جنت کے اندر بھی اقسام ہیں، جنت کی سو قسمیں ہیں ایک خاص جہت سے (ترجمان السنۃ ج۱، ص: ۲۸۵)۔ ان میں سب سے ہائی کلاس جنت الفردوس ہے، اسی لیے حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ جب جنت کا سوال کرو تو جنت الفردوس مانگو (متفق علیہ) اور جنتِ عدن جو ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی تجلیات نے گھیر رکھا ہے، تو مرکزی جنت جنتِ عدن ہے، اسی تجلیات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ وہاں نہ حور ہے نہ قصور ہے بلکہ ذاتِ باری کا نور ہے، تو ان حقائقِ غامضہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ درحقیقت متصوفانہ کلام ہے۔

نورِ حق اور نورِ روح کی ایک علامت

اس لیے اس راستہ میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی ذکر کرتے کرتے اور شیخ کی صحبت میں رہتے رہتے ان حقیقتوں تک پہنچے گا تو وہ علمی طور پر سمجھانے کے بجائے وہاں خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ تجلی کی کتنی قسمیں ہیں۔

شیخ یحییٰ منیری رحمہ اللہ ایک بزرگ ہیں وہ زندگی بھر سجدہ کرتے تھے حقِ تجلی میں، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نورِ روح تھا جو ان پر ظاہر ہوا تھا (ملفوظاتِ حکیم الامت ج۱۰، خطباتِ

حکیم الامت ج٦، ص: ٤٥٥) پھر اس پر بحث کی ہے کہ اس راہ میں آدمی کو جو انوار نظر آتے ہیں تو وہ کیسے سمجھے گا کہ یہ نورِ حق ہے یا نورِ روح ہے، تو اس کی علامت یہ لکھی ہے کہ حق تعالیٰ کے نور میں ایک شوکت ہے اور نورِ روح میں ایک شکستگی کی کیفیت ہے، اب وہ بہت دقیق بات ہے، اسی لیے حضرت رائپوری رحمہ اللہ کے بعض حضرات کے باب میں لکھا ہے کہ ان کو جہاں دیکھو، وہاں نور ہی دکھتا تھا کہ نہ ضرورتِ طبعیہ کے لیے جاسکتے ہیں اور نہ کچھ اور کرسکتے ہیں۔

ایک عجیب وغریب سوال اور اس کا تسلی بخش جواب

جیسے ایک خان صاحب نے کینڈا میں مجھ سے اشکال کیا کہ میں اپنی بیوی سے صحبت کرتا ہوں تو مجھے یہ خیال آجاتا ہے کہ اللہ میاں مجھے دیکھ رہے ہیں تو بڑی بے چینی اور پریشانی ہوتی ہے، بلکہ بعض دفعہ تو چھوڑ دیتا ہوں اب اس کا کیا حل ہے؟ اور واقعی سوال عجیب ہے، تو اللہ میاں نے ایک مثال میرے ذہن میں ڈالی میں نے کہا دیکھو! ابھی اِن شاء اللہ مسئلہ حل ہوجائے گا اور وہ واقعی بڑے خوش ہوئے، میں نے کہا دیکھو! ایک ماں ہے اور اس کی ایک چھوٹی بچی ہے، اس کو جب پیشاب پاخانہ کرنا ہوتو ماں اس سے کہے گی جاؤ بیٹھ جاؤ تو وہ اس کے سامنے بیٹھ جائے گی کہ ماں بھی اس کو دیکھتی ہے حتی کہ بعض دفعہ پاجامہ نہ کھلتا ہوتو ماں خود کھول دے گی سمجھ میں آیا، لیکن وہی بچی جب بڑی ہوگئی تو اب ماں اِسے پسند نہیں کرتی، تو معلوم ہوا کہ ماں کے سامنے بچی کی دو حالت ہے اور حق تعالیٰ کے سامنے تو ایسا مسئلہ ہے کہ آپ کپڑے پہنے ہوئے ہوتب بھی وہ سب کچھ دیکھتا ہے حتی کہ دل کی کھٹک پر بھی وہ واقف ہے ﴿ أَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ ﴾ (سورۂ ھود، آیت نمبر: ۵) تو میں نے کہا کہ محرمات کے باب میں حق تعالیٰ جو ہے وہاں بھی دیکھتے ہیں اور یہاں بھی دیکھتے ہیں، یہ تھوڑی

ہے کہ اللہ میاں بعض موقعوں پر نہیں دیکھتے اور اسی نے جماع کا حکم دیا ہے اور اسی نے بیوی کا حق اور یہ ساری چیزیں رکھی ہیں، تو بس آپ اسے ایسا سمجھ لیجئے کہ ناجائز مقام پر جماع کرنے کی ایسی مثال ہے جیسے بڑی بچی ماں کے سامنے شرمگاہ کھولے تو وہ خفا ہوگی اور جائز مقام پر ایسے ہے جیسے ماں کے سامنے چھوٹی بچی پاجامہ کھولے، بلکہ بعض دفعہ ماں خود ہی پاجامہ کھول دے گی تو حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے فرمایا گیا کہ ﴿فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ (سورۂ بقرۃ، آیت نمبر: ۲۲۳) تو وہ کہنے لگے کہ اب بڑا اطمینان ہوگیا تو میں نے کہا کہ جب اطمینان ہوگیا تو محنت کرو ماشاء اللہ۔

ہر بات علماً نہیں سمجھائی جاسکتی

تو کعبہ کی تجلی کو تجلیٔ بے کیف کہتے ہیں، لہٰذا جہاں جہاں صوفیاء کے کلام میں اس قسم کی چیزیں ملتی ہیں وہ اصل میں ان لوگوں کے لیے ہیں جو بہت بڑے درجہ کے شخص تھے اور وہ چیزیں ان پر منکشف ہوئیں۔ اور دیکھیں بعض مرتبہ آدمی کسی چیز کو علماً سمجھنا چاہتا ہے، لیکن وہ علمی چیز نہیں ہوتی ہے وہ تو آدمی مجاہدہ کرتا رہتا ہے اور اس کا قلب مجلی مصفی ہوجاتا ہے تو وہ چیزیں خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں جیسے جماعت (تبلیغی جماعت) والے کہتے ہیں کہ (حضرت نے یہ بات ہنستے ہوئے فرمائی کہ) یہ کام کرتے کرتے سمجھ میں آتا ہے تو جیسے اس کی نزاکتیں ہیں، تو پھر اس کی نزاکتیں تو بہت زیادہ ہیں، مگر اس مقام کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں ہزاروں لاکھوں میں عارفِ صحیح کوئی ایک ہوتا ہے، باقی اس کو علمی طور پر سمجھنے کے لیے اس کی اصطلاحات کو سمجھنا پڑے گا۔

سوال: حضرت نماز کے اندر ہماری جو حالت ہوتی ہے کہتے ہیں کہ وہ اصلیت سے تعلق رکھتی ہے اور غیرِ نماز میں جو حالت ہے وہ ظلال سے تعلق رکھتی ہے اس کا کیا مطلب؟

حضرت نے فرمایا کہ رجوع الی اللہ کی جو حالت نماز میں ہوتی ہے اس کا ذاتِ

باری سے خاص تعلق ہے نورِ ذات سے اور جو ہے اس میں صفات تو اس کو ظلال سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

اصل میں ظلال ظل کو کہتے ہے ''سایہ''، اور وہاں کوئی سایہ ہے نہیں تو وہاں صفات کے کچھ خاص مراتب ہیں، اس کی طرف اشارہ مقصود ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا جو معاملہ ہے وہ ایسا ہے کہ اس میں گفتگو کرنا ہی بڑا نازک ہے، اب آپ دیکھئے کہ '' حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے'' (بخاری) اور کافروں کے متعلق ہے کہ ان کو ہمیشہ جہنم میں عذاب ہوگا، تو محی الدین ابنِ عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو صفات کا درجہ ہے وہ نہیں ہے، ایک ہے صفتِ رحمت اور ایک ہے صفتِ غضب، تو صفتِ غضب پر صفتِ رحمت غالب ہے، مگر کافروں کے ساتھ جو غضب ہے وہ غضبِ ذاتی ہے غضبِ صفتی نہیں ہے، نہیں سمجھ میں آیا؟۔ یہ بھی عجیب بات ہے یہ انہیں کا حق ہے کہ وہ ایسی بات کریں بڑے لوگ ہیں ویسے بہت سی جگہوں پر ابنِ عربی کے مسلمات پر کلام بھی کیا گیا ہے ان کے تفردات بھی ہوتے ہیں، اس لیے بہت دقیق کلام ہے۔ اور علمِ کلام کے ساتھ اگر کچھ وابستگی ہو تب ہی آدمی صوفیاء کے کلام کو سمجھ سکتا ہے، تو وہ فرماتے ہیں کہ غضبِ ذاتی کی طرف اشارہ ہے۔ تو ایک ہے ذات اور ایک ہے صفت اور اصل میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا نچوڑ دو صفتیں ہیں: (۱) غضب (۲) رحمت (فیضِ ابرار، جلد ہفتم ص: ۱۱۶) اور ان صفتوں ہی سے افعال وجود میں آتے ہیں اور پیغمبر جو ہے اس کا معجزہ وہ افعالِ خداوندی ہوتا ہے (درسِ قرآن، ص: ۲۵۳) اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات میں سے دو معجزے بڑے مشہور ہیں: (۱) ''عصاءِ موسوی'' موسیٰ علیہ السلام کا ڈنڈا جو صفتِ غضب ہے، یہ صفتِ غضب کا مظہر ہے کہ اس کو دیکھ کر فرعون کو دست لگ گئے، حالانکہ فرعون ایسا تھا کہ چار سو سال تک اس کو سر میں درد نہیں ہوا ہے، لیکن جب اژدہا دیکھا تو اسی وقت

سے دست کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور ہاتھ جو ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مظہر ہے تو یہ صفتِ غضب اور صفتِ رحمت کا مظہر فعل کے درجہ میں ہے، اور معجزہ جو ہے وہ افعالِ خداوندی ہے، اس لیے اس مقام پر اگر چہ نسبت بندہ کی طرف ہے، لیکن حقیقۃً فاعل اللہ تعالیٰ ہیں کہ ﴿ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ (سورۂ انفال، آیت نمبر: ۱۷)۔

حضور ﷺ نے انگلی کا اشارہ کیا چاند کی طرف تو وہ دو ٹکڑے ہوگیا (بخاری) اگر آپ ﷺ سورج کی طرف کرتے تو وہ بھی دو ٹکڑے ہو جاتا، اور آسمانوں کی طرف کرتے تو وہ بھی ٹکڑے ہو جاتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ بلّوری کانچ لیں تو دھوپ جو ہے وہ ویسے عام حالات میں جلاتی نہیں ہے، لیکن بلّوری کانچ لے کر آپ کسی کاغذ پر یا روئی پر اس کا اثر ڈالے تو اتنے ایریہ میں جتنے میں اس کا پھیلاؤ ہے وہ جمع ہو کر ایک مقام پر پڑی تو اب عادت کے خلاف چیز ظاہر ہورہی ہے کہ اب وہ اس کو جلا دیتی ہے، تو نبوت کی باطنی قوتیں جب مجتمع ہو کر کسی ایک طرف متوجہ ہو جائے تو پھر چاند و سورج آسمان و زمین کوئی چیز اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ افعالِ خداوندی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ چاند کی کیا بساط ہے کچھ بھی نہیں۔

نائبانِ رسول کے مقام کی ایک جھلک

اور یہ جو نائبانِ رسول ہیں بڑے حضرات ان کے حالات بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمہ اللہ جب خفا ہو کر نکلے تھے جھنجھانہ سے تو جس محلے کا وہ تصور کرتے تھے وہاں آگ لگ جاتی تھی۔ لاہور میں ایک شخص تھے وہ کہتے تھے کہ میں جب چاہوں گا لاہور کو الٹ دوں گا (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۲، ص: ۴۰۸) اہل اللہ کے معاملات تو عجیب ہوتے ہیں۔

ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ ایک مرتبہ جبل ابوقبیس پر تشریف فرما تھے تذکرہ یہ فرمایا کہ

بعض اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ پہاڑ کو اگر یہ کہیں کہ چل تو وہ چلنے لگتا ہے یہ فرماتے ہی اس پہاڑ کو جنبش ہونے لگی، آپ نے فرمایا ٹھہر جا، میں تو قصہ بیان کرتا تھا وہ ٹھہر گیا۔ (تذکرہ مشائخ چشت ص: ۱۳۹)

حضرت ابوالحسن رحمہ اللہ کا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اہل اللہ ایسے ہوتے ہیں کہ گھر میں جتنی چیزیں رکھی ہیں ان کو اگر یہاں کھڑے کھڑے حکم دیں تو وہ گھر سے باہر آنا شروع ہوجائے ابھی انہوں نے حکم نہیں دیا تھا صرف یہ الفاظ بولے تھے کہ اندر سے بستر، پلنگ، وغیرہ باہر آنا شروع ہوگئے خود بخود، تو انہوں نے کہا کہ حضرت آپ اندر ہی تشریف رکھیں میں نے ابھی حکم نہیں دیا ہے۔

جالینوس یا بوعلی سینا کا زمانہ ہے ابوالحسن نوری رحمہ اللہ ایک بزرگ تھے انہوں نے کہا کہ کرامت حق ہے یعنی عادت کے خلاف ہونا، تو بوعلی سینا کہتے تھے کہ اس کے پیچھے کوئی سبب ضرور ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اچھا پتھر لاؤ پھر پتھر پھینکا تو شیخ الرئیس کہتے تھے کہ جہاں تک تمہارا زور ہے پتھر وہاں تک جائے گا پھر زمین کی کشش اسے کھینچ لے گی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تو اسبابِ طبعی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اس کے خلاف ظاہر کر سکتے ہیں کراماتاً۔ چنانچہ انہوں نے پتھر پھینکا تو وہ غائب اب یہ انتظار کر رہے ہیں کہ آئے، لیکن وہ آتا کائی کو وہ تو گیا، تو عجیب عجیب معاملات ہوتے ہیں یہ بڑے لوگوں کی بات ہیں۔ تو مضمون بہت دقیق چھیڑ دیا آپ لوگوں نے کہ تجلیٔ بے کیف اس کے الوان اور اس کی قسمیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات وغیرہ اسے آپ گویا یوں سمجھیں کہ... ؎

یہ منزلِ خاص ہے رہ گزر عام نہیں

وہ شیخ نہیں مینخ تھا

ان باتوں میں سے تھوڑا بہت تو پلّے پڑا ہوگا نا، وہ ایک لطیفہ یاد آ گیا لطیفہ کیا ہوگا

کم علمی کی بات ہے۔ایک شخص سے ایک آدمی بیعت تھا شیخ کوتو مرید کا مزاج سمجھنا ہوتا ہے،بس اس پر غلبہ ہوگیا کہ میں تو شیطان ہوگیا،مردود ہوگیا،ایک کیفیت طاری ہوگئی تو وہ شیخ کے گھر پر آیا اور گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، پوچھا کون؟ تو کہا کہ میں مردود ہوگیا ہوں، اندر سے انہوں نے کہا کہ مردود ہوگئے،تو جاؤ یہاں سے اس پر ایسی کیفیت تھی کہ یہ سنتے ہی اسی حال میں انتقال ہوگیا(حکایاتِ اولیاء،ص:۲۲۳) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ اس واقعہ پر فرمایا کرتے تھے کہ وہ شیخ نہیں تھے میخ تھے۔دقیق بحث کی وجہ سے دماغ پر بوجھ زیادہ پڑتا ہے،اب کل پر رکھیں حضرت؟

شیخ کی ضرورت کیوں؟

اب یہ کہ شیخ کی ضرورت کیوں ہے؟ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر لائن کے لیے آدمی محتاج ہے اس بات کا کہ اس کو کوئی راہبر اور رہبری ملے اس لائن کی کوئی گائڈ ہو اس کا، جیسے کوئی ڈرائیونگ سیکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے کوئی راہبر ہوتا ہے، اسی طرح اور چیزیں ہیں تو جب دنیا کی چھوٹی چھوٹی لائنوں میں راہبرکی اور علم کی ضرورت ہوتی ہے یہ مسلم ہے،تو حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اور لائنوں میں تو جہالت چلتی نہیں۔بس یہ اللہ میاں کی لائن ہی ایسی گئی گزری ہے کہ اس میں جہالت چل جائے گی؟ دیکھیں! آپ کسی پینٹر کے پاس جائیں اور کہیں کہ مجھے ملازم رکھ لیجئے، تو وہ پوچھے گا آپ سے کہ پینٹنگ سیکھی ہے آپ نے؟ آپ کہیں کہ نہیں،تو وہ کہے گا معاف کرو،اسی طرح آپ کسی سیٹھ صاحب کے پاس جائیں کہ بھئی آپ کی کار ہے مجھے ڈرائیور رکھ لو،تو وہ پوچھے گا ڈرائیونگ سیکھی ہے آپ نے؟ تو آپ کہیں کہ نہیں کوشش کریں گے تو وہ کہے گا کہ آپ تشریف لے جائیں،اسی طرح ایک شخص مطب لے کر بیٹھے اور ڈاکٹری کا دعویٰ کرے بغیر سیکھے،اب ایک سرکاری آدمی آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ آپ

کے پاس ڈاکٹری کا سرٹیفکٹ ہے؟ تو وہ کہے کہ نہیں بس ایسے ہی ذرا شوق ہو گیا تو ظاہر ہے کہ اسے جیل میں بٹھایا جائے گا، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ دنیا کا کوئی کام ہو اس میں عقل کی، علم کی، تجربہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو حضرت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ اتنا گیا گذرا نہیں ہے کہ جہالت کے ساتھ طے ہو جائے کہ ہو گئے باوا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا راستہ تو بہت اہم ہے، اس لیے اس میں تو کسی راہبر کی بہت زیادہ ضرورت ہے، اس کی ضرورت میں تو کلام ہو ہی نہیں سکتا ہے، یہ نہیں کہ جس کو جو سمجھ میں آیا وہ بن گیا باوا کہ لمبا جبہ پہن لیا، ہاتھ میں تسبیح لے لی، سر پر عمامہ باندھ لیا کہ بہت پہنچے ہوئے ہیں، تو اس کی صورت تو ہے شیخ کی، مگر حقیقتِ شیخ وہ رخصت ہے، تو شیخ کی بھی کچھ صفات بیان کی گئی ہیں۔ بس اب میں تھک گیا ہوں اور آج جمعہ کی رات بھی ہے، میرا خیال ہے اب موقوف رکھیں، کل بیان کریں گے ان شاء اللہ۔

کعبۃ اللہ کا تصور اور اس کو دیکھنے کے فوائد

حکیم الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کعبۃ اللہ پر جو تجلیٔ بے کیف ہے اگر کسی کی نسبت ناقص ہے یعنی وہ صاحبِ نسبت ہے مگر ابھی نسبت ناقص ہے، تو اگر وہ بیت اللہ کا تصور بھی رکھے گا تو نسبت کامل ہو جائے گی، کتنا عجیب ہے کہ نسبت میں بھی اس کو دخل ہے، اسی لیے کچھ چیزیں ہیں جن کا دیکھنا بھی عبادت ہے۔

(۱) قرآنِ کریم کو عظمت کے ساتھ دیکھنا (۲) بیت اللہ کو دیکھنا (۳) عالمِ ربانی کو محبت کی نگاہ سے دیکھنا کہ وہ حضور ﷺ کا نائب ہے (دارِ قطنی) اور حدیث شریف میں ہے کہ بیت اللہ پر روزانہ ایک سو بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں؛ طواف کرنے والے پر ساٹھ رحمتیں اور بیت اللہ میں نماز پڑھنے والے پر چالیس اور بیت اللہ کو دیکھنے پر بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں (بیہقی، فضائلِ حج، ص:۸۲) تو اگر کوئی حج یا عمرہ کے لیے جائے اور طواف

کرتے کرتے تھک گیا ہو، تو باتوں میں مشغول ہونے کے بجائے کسی کونے میں بیٹھ جائے اور اسے دیکھتے رہے عظمت کے ساتھ، تو کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ دو کیفیتیں محسوس کریں گے، ایک تو اس کی عظمت قلب میں آئے گی اور دوسری انس اور مانوسی کی کیفیت پیدا ہوگی ۔اگر اللہ تعالیٰ کسی کو وہاں جانے کی توفیق دے تو اسے دھیان سے دیکھنا یہ دونوں چیزیں وہ محسوس کرے گا، تو اگر طواف کرتے کرتے یا پڑھتے پڑھتے تھک جائے تو گھنٹہ، آدھ گھنٹہ بیٹھ کر اسے دیکھتے رہو، کسی اور چیز میں بالکل ٹائم پاس نہیں کرنا ہے اگر تھک گئے ہو تو اسے دیکھتے رہو، بہت سے لوگ آتے ہیں بیت اللہ میں تو میں نے دیکھا کہ اسے دیکھتے رہتے ہیں۔

پتہ نہیں کیسے کیسے اولیاء اللہ وہاں آتے ہیں، لیکن پتہ بھی نہیں چلتا وہ اپنے کو چھپا کر رکھتے ہیں، تو یہ کام کریں یہ آسان ہے، اس لیے کہ بھائی ہم لوگ کتنے طواف کریں گے ایک، دو، تین، چار، پانچ، دس اور گرمی کا زمانہ اور جو لوگ ٹھنڈے ملک میں رہ کر جاتے ہیں تو ان کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہوتا ہے، تو یہ کہ وہاں وقت ضائع نہ ہو جتنا چاہے ایک گھنٹہ دو گھنٹے بس اسے دیکھتے ہی رہیں وہ بھی بہت نافع ہے۔ وہاں ایسی روحانی لائٹ ہے کہ پوچھو مت، اور پرندوں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ اڑتے ہوئے وہاں آتے ہیں تو ایکدم یوں (حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اشارے سے حاضرین کو وہ کیفیت بتلائی) ہو جاتے ہیں، کبھی دیکھنا اب تو نہیں ہوتے پہلے کبوتر وغیرہ بہت ہوتے تھے۔امام رازی اور ابنِ جوزی رحمہما اللہ نے بھی لکھا ہے کہ پرندوں کے غول کے غول آتے ہیں، مگر وہ تعظیماً کعبہ شریف کے اوپر سے نہیں گزرتے، بلکہ اس کے قریب آکر دائیں بائیں سے گزر جاتے ہیں (تفسیرِ کبیر ج ۳، زاد المیسر ج ۱) البتہ بعض کبوتر اس کے اوپر سے گذرتے ہیں تو اس کی وجہ جلالین شریف کے حاشیہ میں لکھی ہے کہ جو

پرندہ بیمار ہوتا ہے وہ شفا حاصل کرنے کے لیے اوپر سے گذرتا ہے اور اسے شفا ہوجاتی ہے، اور یہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کبوتر اڑے اور بیت اللہ کے پاس جا کر یوں (حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پھر وہ کیفیت اشارے سے حاضرین کو بتلائی) ہو جاتے ہیں ،اور بعض اوپر سے گذرتے ہیں ،تو معلوم ہوا کہ جو بیمار ہوتے ہیں وہ حصولِ شفا کے لیے اوپر سے گذرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو شفا دے دیتے ہیں۔

بیت اللہ کا احترام زمانۂ جاہلیت میں بھی تھا

اور بیت اللہ کا احترام زمانۂ جاہلیت میں بھی تھا کہ اس وقت کسی کا مکان بیت اللہ سے اونچا نہیں ہوتا تھا، اور آپ ﷺ کے غارِ حرا میں عبادت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنہائی اور بلندی تو تھی ہی اور دوسرا یہ کہ وہاں سے بیت اللہ بھی نظر آتا تھا (کشف الباری شرحِ بخاری ج ۱،ص: ۳۳۷) اور جاہلیت کے زمانہ میں بیت اللہ کی خصوصیت یہ بھی لکھی ہے کہ کسی کا غلام اگر بیت اللہ پر چڑھ جاتا تو وہ اسے آزاد کر دیتے۔اور بیت اللہ کی جب نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہی تو انہوں نے سوچا کہ اگر اسے توڑا تو عذاب نہ آجائے، اس لیے پہلے ایک آدمی کو چڑھایا اس کے بعد جب دیکھا کہ اس نے اینٹ ہٹائی اور عذاب نہیں آیا تو پھر لوگوں نے یہ کام انجام دیا۔ اور ایک چور کے متعلق شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وہ چوری کر کے اندر داخل ہوا تو بیت اللہ کا دروازہ اس شان کے ساتھ بند ہوا کہ اس کی گردن الگ ہوگئی۔

حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک خصوصیت

اور صحابہ میں سے صرف حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش بیت اللہ کے اندر ہوئی ہے۔امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اگلے پچھلوں میں کسی کی یہ خصوصیت

نظر نہیں آتی ، اور یہ جو حدودِ حرم ہیں اصل میں اس کی بنیاد نور ہے اور وہ حجرِ اسود کے نور کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا نور جہاں تک پھیلا وہاں تک حدودِ حرم ہیں، تو گویا حرم کی جو بارڈر قائم ہوئی ہے اس کے لیے جو میٹر اور معیار تھا وہ نور تھا (ملفوظاتِ حکیم الامت) اور بھی بڑی مناسبات ہیں عجیب عجیب، یہ ایک دنیا ہے مستقل اور ایک عالم ہے۔

سوال: کیا جو آدمی حجرِ اسود کو بوسہ دے گا تو وہ اس کے متعلق قیامت میں ایمان والا ہونے کی گواہی دے گا؟

محی الدین ابنِ عربی رحمہ اللہ کا ایک مکاشفہ

تو حضرت نے فرمایا کہ شیخ محی الدین ابنِ عربی رحمہ اللہ ایک صاحبِ کشف بزرگ گذرے ہیں انہوں نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا تو وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نظرِ کشفی سے دیکھا کہ حجرِ اسود پھٹا اور میرے کلمۂ شہادت کا ایک روحانی جسم بنا اور وہ اس میں داخل ہوا اور بند ہوگیا اور حجرِ اسود میں سے میں نے آواز سنی کہ اَے ابنِ عربی! تمہاری امانت میرے پاس محفوظ ہے کل میدانِ قیامت میں سپرد کروں گا، اور کتابوں میں لکھا ہے کہ جو عظمت کے ساتھ اس کو چھوتا ہے وہ اس کے لیے قیامت میں ایمان والا ہونے کی گواہی دے گا۔ (سبق آموز بیانات ص ۲۵۷)

ایک لطیفہ سن لیں تھکان اڑانے کے لیے۔ ایک عورت تھی نہایت خوبصورت اس سے کسی نے نام پوچھا تو اس نے کہا کہ میرا نام مکہ ہے، اب اس کے گالوں پر تل تھا تو اس نے کہا کہ جب آپ مکہ ہے تو اس حجرِ اسود پر بوسہ کی اجازت مل جائے، تو اس عورت نے کہا کہ اس کے لیے نان ونفقہ شرط ہے (فیضِ ابرار ج ۹، ص: ۳۰۷) خبر نہیں آپ کے پلّے بھی پڑا کہ نہیں۔

مجلس نمبر (۳)

بزرگی کا معیار اتباعِ شریعت ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس نمبر (۳)

نبی اور رسول کا فرق

سورۂ فاتحہ میں فرمایا گیا ہے ﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ (سورۂ فاتحہ آیت نمبر:٦) اور پھر پانچویں پارے میں اس کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ انعام یافتہ لوگ یہ ہیں ﴿ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ ، وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقاً ○ ﴾ (سورۂ نساء، آیت نمبر:٦٩) سب سے بڑا طبقہ جو ہے وہ رسولوں کا ہے، انبیاءِ کرام علیہم السلام ایک اثر کے بموجب دو لاکھ ہیں، اور مشہور قول کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں (ترجمان السنۃ ج۳، ص:۴۵۴) اور رسول جو ہیں وہ تین سو تیرہ ہیں (ترجمان السنۃ ج۳، ص:۴۵۴) بعضوں نے کہا ہے کہ نبی اور رسول دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے (حاشیہ شاہ عبد العزیز دہلوی علی شرح العقائد، ص: ۱۳۷) مگر اس کی تردید ہوتی ہے اس سے کہ ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ﴾ (سورۂ حج، آیت نمبر:۵۲) دیکھئے! یہاں بیچ میں واو آیا ہے واو عاطفہ تو معلوم ہوا کہ دونوں میں فرق ہے (قاموس الفقۃ ج۵، ص:١٦٦) اور بعضوں نے کہا ہے کہ نبوت ورسالت وہ دونوں ضد ہیں یعنی الگ الگ ہیں، مگر اس کی بھی تردید کی گئی ہے کہ قرآنِ مجید میں ہے: ﴿ إِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلاً وَّنَبِياًّ ﴾ (سورۂ مریم، آیت نمبر:۵۴) اور تیسرا قول یہ ہے کہ نبی جو ہے وہ خاص ہے اور رسول عام ہے کہ رسول انسانوں میں بھی ہے اور ملائکہ میں بھی ہے۔

اور چوتھا قول یہ ہے کہ رسول خاص ہے اور نبی عام ہے (قاموس الفقۃ، ج۵) اور یہ قول کلامیہ کا ہے کہ رسول جو ہے وہ صاحبِ شریعت ہوتا ہے یا صاحبِ کتاب ہوتا ہے

عموماً، تو تین سو تیرہ رسول ہیں اور نبوت سے بھی فائق رسالت کا درجہ ہے تو دینی کمالات میں سب سے بڑا درجہ نبوت ہے اور اس سے بڑھ کر رسالت ہے تو ہر رسول نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا، اس لیے فرمایا کہ " لا نبي بعدي " (سننِ ابنِ ماجہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے جب نبی نہیں تو رسول کا نہ ہونا تو بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو گیا، تو سب سے بڑا درجہ انبیاء کا ہے اور اس میں پھر رسولوں کا اور وہ تین سو تیرہ ہیں، پھر ان میں سے اللہ تعالیٰ نے پانچ کا انتخاب کیا نوح وابراہیم، موسیٰ وعیسیٰ ومحمد علیہم السلام، پھر اس میں سے تین کا انتخاب کیا موسیٰ، عیسیٰ ومحمد علیہم السلام، اور اس میں سے پھر آپ ﷺ کا انتخاب کیا اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد جو درجے ہیں ان میں تین طبقے ہیں: صالح، شہید، اور صدیق۔ بعض علماء لکھتے ہیں کہ نبوت اور صدیقیت کے بیچ میں بھی ایک مقام ہے جس کا نام قرب ہے، مگر وہ کمزور بات ہے۔

نبوت کے بعد مقامِ صدیقیت ہے

اور راجح اور اقویٰ بات یہی ہے کہ نبوت کے بعد صدیقیت کا درجہ ہے، صدیقیت روحانیت کا وہ درجہ ہے کہ جس کا کنارہ نبوت سے ملتا ہے، اور صدیق وہ ہے جس کا باطن اس کے ظاہر سے مغائرت نہ رکھتا ہو، یعنی اس کے ظاہری حالات سے اس کے باطن کی استقامت علی طریق الحق متاثر نہ ہو (روح المعانی) اور لکھا ہے کہ جہاں نبی کے قدم ہوتے ہیں وہاں سے صدیقین کا سر شروع ہوتا ہے (خطباتِ اکابر ج۲ ص۲۲۰)۔ ویسے تو ہر صحابی صدیق ہے مگر سب سے اعلیٰ درجہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایک پورا محل تسلیم کرے آپ کہ ایک ہال ہے اور اس میں سارے صحابہ جمع ہیں تو سارے صحابہ صدیق ہیں اور ان میں حضرت ابوبکر صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

اب یہاں ایک علمی اشکال ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ” لو كان بعدي نبي لكان عمر“ (ترمذی) تو ” لكان أبا بكر “ کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے یہ دیا کہ آپ ﷺ نے ” لو كان بعدي نبي لكان عمر “ فرمایا، اس میں ” بعدي “ کا لفظ ہے، اور ” بعدي “ میں غیبوبیت ہے اور صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو ذاتِ رسول میں فنا ہے بالکل اس میں غیبوبت ہے ہی نہیں (فیضِ ابرار، ج ۷، ص: ۱۴۳) تو میں عرض کر رہا تھا کہ سب سے بڑا درجہ نبوت و رسالت ہے اور اس کے بعد مقامِ صدیقیت ہے۔

دو درجے علمی ہیں اور دو عملی

اس کے بعد پھر دو درجے ہیں: ایک شہادت کا اور دوسرا صلح کا، اور صلح ایک ایسا وصف ہے جو سب کے ساتھ شریک ہیں، پیغمبروں کے باب میں فرمایا کہ ” كل من الصالحين “ ﴿ وزكريا ويحيى وعيسى وإلياس كل من الصالحين ○ ﴾ (سورۂ انعام، آیت نمبر: ۸۵)

مجھے یہاں ایک بات یاد آئی، دیکھئے! حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ کے خاندان میں حضرت کا نام زکریا، باپ کا نام یحییٰ، چچا کا نام الیاس، اور ایک اور تھے عیسیٰ، تو گویا ” كل من الصالحين “ تو صلح کا اعلیٰ درجہ یہ پیغمبری کا ہے اور یہ صلح کا مفہوم پھر ہر ایک میں چلتا ہے تو گویا ادنیٰ درجہ ہے صالح ہونا اور اعلیٰ درجہ ہے رسول ہونا۔

اور اگر آپ علمی باتیں سمجھ سکتے ہیں تو آگے کی بات یہ ہے کہ نبوت اور صدیقیت یہ دو علمی درجے ہیں اور شہادت و صلح یہ دو عملی درجے ہیں (خطباتِ اکابر ج ۲، ص: ۲۲۱) اور ”نبا“ کے معنی خبر دینے کے ہیں۔ فرمایا کہ ﴿ عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ ○ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيْمِ ○ ﴾ (سورۂ نبا آیت: نمبر: ۱،۲) تو خبر از قسم علم ہوتی ہے براہِ راست حق تعالیٰ ان پر علم نازل فرماتے ہیں، صدیقین ان کی تصدیق کرتے ہیں اور تصدیق بھی تو علم اقسام علم میں سے ہے

(حوالہ بالا) تو گویا نبوت وصدیقیت یہ مراتبِ علمیہ ہیں اور شہادت وصلح یہ دو عملی درجے ہیں، یہ علمی بات ہے شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ بہرحال! یہ چار درجے ہیں، اور نبوت کا دروازہ تو بند ہوگیا ہے، البتہ صدیقیت کا درجہ قائم ہے۔

صوفیاء کے یہاں بہت درجات ہیں

ویسے صوفیہ کے یہاں بہت درجات ہیں اور وہ سب اسی کی ترجمانی ہے، ایک مرتبہ ہے اخیار کا، دوسرا اوتاد کا، تیسرا ابرار کا، پھر اقطاب کا، امامین کا، نقباء کا، نجباء کا، عمد کا، مکتومان کا، مفردان کا (انوار العارفین) اس کے بعد اسی طریقہ سے ابدال ہے اور پھر غوثیت ہے پھر اس کے بعد صدیقیت ہے اور اس میں پھر بڑی مناسبات ہیں، ایک السالک المجذوب ہے اور دوسرا المجذوب السالک ہے، پھر اس میں سے ایک کو منیب کہتے ہیں (خطباتِ حکیم الاسلام ج۲، ص:۵۹۳) منیب جو ہے محبّ کے معنی میں ہے اور مجذوب جو ہے محبوب کے معنی میں ہے، تو محبوبین اور منیبین اس طریقے کی بھی تعبیر کرتے ہیں، فرمایا کہ ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ ﴾ (سورۂ شوریٰ، آیت نمبر:۱۳)

تو ولایت ایسے ہے جیسے ڈگری اور نبوت ایسی ہے جیسے پوسٹ، تو نبوت کا منصب ادھر سے ملتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے (فیضِ ابرار، ج۴، ص:۱۴۷) اسی لیے غیر نبی کبھی نبی نہیں بن سکتا، چاہے وہ کتنی ہی عبادت کرے۔ ہاں! ولی بن سکتا ہے لیکن ولایت کے بھی اسباب ہیں کہ اس پر پھر ولایت کا رتبہ مرتب ہوتا ہے تو ولایت بھی ادھر ہی سے مرتب ہوتی ہے۔

ولایت بھی موہبت ہے

اسی لیے صوفیاء کے یہاں یہ مشہور ہے کہ بعض مرتبہ ایک آدمی ایک ہزار سال تک

مجاہدہ کرتا ہے، مگر وہ ترقی نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے اور بعض مرتبہ ادھر سے فضل ہو جائے تو سیکنڈوں اور منٹوں میں ہزاروں سال کے راستے طے ہو جاتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ولایت بھی موہبت ہے یعنی اسی کی عطا ہے، اسی کی دین ہے، ہاں کوشش اور اس کے اسباب جو ہیں وہ اختیاری ہیں، جیسے تقوی ہے ذکر ہے وغیرہ، اگر کوئی اس کو اختیار کرے تو ولایت ان شاء اللہ مرتب ہو جائے گی، تو صدیقیت کا درجہ بہت بڑا ہے، ویسے ہر صحابی صدیق ہوتا ہے اور اولیاء اللہ میں بھی صدیق گذریں ہیں، اسی لیے لکھا ہے کہ ایک بزرگ ایک بستی سے خفا ہو کر چلے گئے تو پھر اس مقام پر کبھی کوئی صدیق پیدا نہیں ہوا، تو عجیب عجیب معاملات ہوتے ہیں۔

ایک پٹواری کا واقعہ

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ الٰہ آباد کے قریب ایک جنگل کا واقعہ سناتے تھے، آپ خود گئے ہوں گے یا کسی سے سنا ہوگا کہ وہاں ایک چھوٹی سی مسجد دیکھی، پوچھا گیا کہ یہاں مسجد کیسی؟ تو کہا گیا کہ یہاں ایک چھوٹی سی بستی ہے وہاں ایک پٹواری رہتا تھا وہاں کوئی بزرگ گئے ہوں گے اس نے ان کی خدمت کی تو انہوں نے فرمایا کہ اچھا ہم تمہیں ایک چیز دیتے ہیں اتنے میں ایک گھوڑ سوار آیا اور کہا کہ آپ کے لیے مقامِ ولایت طے کیا گیا ہے، اس کے بعد کچھ وقفہ گذرا تو اس نے ان کی بے ادبی کی تو بزرگ نے زمین پر سے مٹی اٹھائی اور یوں کہا کہ جاؤ ہم نے آپ کا نام ولایت سے کاٹ دیا، یہ کہنا تھا کہ ایک گھوڑ سوار دوڑتا ہوا آیا اور اس نے اس بزرگ سے کہا کہ آپ کے لیے فلاں مقام سے آرڈر آیا ہے آپ کو وہاں جانا ہے اور اس مقام کی جو تجویز تھی وہ ڈسمس کردی گئی ہے۔ پھر اس پٹواری نے بہت منت وسماجت کی تو وہ بزرگ پھر خوش ہوگئے تو پھر آرڈر آیا، تو عجیب معاملات ہوتے ہیں اللہ والوں کے، تو اس پٹواری نے خوش ہو کر

پھر بطورِ یادگار یہ مسجد بنائی، حضرت فرماتے تھے کہ وہ نان بائی تھا۔ تو جیسے ملائکہ کا ایک نظام ہے ویسے انسانوں کا بھی ایک نظام ہے، مگر ایسے آدمی بھی مخفی ہوتے ہیں ویسے کرتے حق تعالیٰ ہیں۔

ملازمت سے ابھی نام کاٹتا ہوں

تو بات یہ چل رہی تھی کہ اہل اللہ کے معاملات عجیب ہوتے ہیں، ہمارے حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ پر جذب کا غلبہ تھا، بمبئ میں حضرت کے ایک مرید تھے حضرت کو رمضان میں الہ آباد جانا تھا تو وہ مرید بکنگ کرانے گئے تو ان کو تعصب کی وجہ سے ٹکٹ نہیں دیا، رمضان کا زمانہ تھا اور اوپر سے گرمی، تو حضرت سے آ کر کہا کہ ایسا ایسا ہوا ہے تو حضرت نے کہا کہ آفیسر سے جا کر کہو کہ اگر ٹکٹ نہیں دیا تو ابھی ملازمت سے تیرا نام کاٹتا ہوں کہ یہاں ہاتھ پھیلا کہ اوپر سے آرڈر آئے گا، بس جا کر یہی کہو، واقعۃً وہ تھے بھی ایسے ہی چنانچہ پھر اس نے بکنگ کردی۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی ایک کرامت

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ بڑے مانے ہوئے شخص وہ بمبئ گئے، وہاں ایک بچے نے سوئی نگل لی اور سوئی تو ایسی چیز ہے کہ جہاں جائے گی وہاں چبھے گی، اب آپریشن کے بغیر کوئی چھٹکارا نہیں تھا، اس بچے کے والد کا حضرت سے تعلق تھا تو انہوں نے حضرت سے کہا کہ ایسی صورتِ حال ہے اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپریشن کے بغیر چھٹکارا نہیں، تو فرمایا کہ میں دعا کرتا ہوں تم اسے ضرورت کے لیے لے جاؤ (یعنی بڑے استنجاء کے لیے لے جاؤ) چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اسے حاجت ہوئی اور وہ سوئی صحیح سالم نکل آئی، تو بعض ڈاکٹر نے کہا کہ اگر اس واقعہ کو ہم اپنی انکھوں سے نہ دیکھتے تو ہم اس پر

یقین نہ کرتے ، اس لیے کہ اندر اتنی آنتیں اور اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ اس کے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے وہ تو دعا کا معاملہ تھا، اور سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، تو ایسے عجیب عجیب واقعات ہیں۔

وصی الامت رحمہ اللہ کی دو کرامتیں

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ الٰہ آباد سے پہلے فتح پور میں تھے ، وہاں کچھ لوگوں نے حضرت کے ساتھ شرارتیں کیں ، وہاں اوباشوں کی کچھ دکانیں تھیں تو حضرت وہاں سے خفا ہو کر نکل گئے ،حضرت کی خانقاہ کے پیچھے ایک تالاب تھا جس روز حضرت کا وہاں سے قدم نکلا تو اُس وقت سے تالاب میں ایک مچھلی بھی نہیں رہی ، عجیب واقعات ہیں ان کے۔

پڑھنے کے زمانہ میں ان کا یہ حال تھا کہ دیوبند میں ایک موصلی کی دکان پر پہنچے، وہاں نماز کا ٹائم ہوگیا تو وہاں پر ایک کنواں تھا اس کے پاس پہنچے تھے کہ پانی اوپر آ گیا، اس کے بعد وضو کیا اور وضو کے بعد پانی پھر نیچے چلا گیا (فیض ابرار ج۵ ،ص: ۲۸۰) اور یہ بات یاد رہے کہ بزرگوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بعضوں سے کرامت ظاہر ہوتی ہے اور بعضوں سے نہیں ہوتی ، اور اس زمانہ میں چونکہ مسمر یزم سحر اور کرشمات وغیرہ کچھ زیادہ ہیں، اس لیے اہلِ حق عموماً کرامت کو ظاہر نہیں کرتے ورنہ التباس ہو جاتا ہے۔

بزرگی کا معیار اتباعِ شریعت ہے

یہی وجہ ہے کہ بزرگی کا سب سے بڑا معیار جو ہے وہ اتباعِ سنت ہے، بیچ میں ایک بات یاد آ گئی کہ شیخ کی پہچان کیا ہے؟ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص آیا آنے کے بعد کچھ دن رہا پھر کہا کہ اچھا اب اجازت ،تو حضرت نے پوچھا کہ

اتنا جلدی کیوں جارہے ہو؟ تو کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ میں نے آپ کی بزرگی کا بہت چرچا سنا تھا، مگر آپ کی کوئی کرامت دیکھی نہیں وہ بھی عجیب آدمی تھے فرمایا سنو! تم میرے پاس جتنا عرصہ رہے تو اس میں مجھ سے کھانے پینے میں چلنے پھرنے میں اٹھنے بیٹھنے میں کوئی خلافِ سنت بات دیکھی؟ اس نے کہا کہ کوئی بھی نہیں، تو فرمایا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کرامت ہے؟ فرمایا ہزار کرامتیں ایک طرف اور استقامت ایک طرف (فتاوی رحیمیہ) مگر انسان چونکہ عجوبہ پسند ہے تو وہ کوئی چمتکار دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ بہت پہنچا ہوا ہے۔

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ایک آدمی ایسے ہی راستہ پر پڑا ہوا تھا تو ایک آدمی نے حضرت سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ یہ آدمی پہنچا ہوا ہے یا نہیں؟ تو حضرت نے کہا کہ میں یہ کہہ دوں کہ یہ پہنچا ہوا ہے تو تم اسے پہنچا ہوا سمجھو گے اور اگر میں نا کہوں تو پہنچا ہوا نہیں سمجھو گے، تو پھر مجھے ہی بڑا مان کر اتباع کرو جب مجھے ہی معیار بنایا ہے۔

اور حضرت فرماتے تھے کہ مشائخ مستقل نہیں ہے، اصل ہے نبی کریم ﷺ، اسی لیے ہمارے لیے اصل معیار اتباعِ شریعت ہے، اسی لیے شیخ کو دین کا علم ہونا ضروری ہے۔ اور صوفیہ کے یہاں یہ کلی قاعدہ ہے کہ " ما اتخذ اللّٰہ جاھلاً ولیاً " کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا اور اگر ولایت دی ہے تو علم دے دیا، اور حضرت فرماتے تھے کہ جب دنیا کا کوئی معمولی آدمی اپنے کام کے لیے جاہل کو پسند نہیں کرتا، تو اللہ میاں کا راستہ اتنا گیا گذرا ہے کہ جہالت سے کام چل جائے گا، تو جب اللہ ولایت دیتے ہیں تو علم کے ساتھ دیتے ہیں وہ علم لدنی ہوتا ہے، جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ کو دین کا بقدرِ ضروری علم تو تھا اور پھر ایسا علم عطا ہوا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ جیسے حضرات ان سے بیعت ہوئے (مسلکِ علماءِ دیوبند) تو شیخ کی

سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ وہ صحیح العقائد ہو اور متبعِ شریعت ہو، اور یہ معیار اتنا بڑا ہے کہ پھر جتنے دکاندار ہیں ان سب کی دکانیں ختم۔ اور یہ بیماری عورتوں میں بہت ہوتی ہے بس ذرا دیکھ لیا کسی کو تو کہہ دیا کہ باوا بہت پہنچے ہوئے ہیں، حالانکہ وہ سب شو ہوتا ہے۔

ہمارے چچا فرماتے تھے کہ ریاست کے زمانے میں ایک آدمی کو شوق ہوا کہ کچھ کمائی کروں تو اس نے اپنے ساتھ دو تین آدمی لے لیے کہ یہاں سے جا کر کسی کالونی میں ٹھہریں گے اور میں زبان سے کچھ نہیں کہوں گا صرف اشارے کروں گا وہ آپ کو سمجھنا ہوگا، چنانچہ اُس نے کرتہ، گنجی، لنگی، سب اتار دیا کہ سارا طباق روشن، پوری دکان کھول دی اور وہ تین چار ساتھ میں ہیں، اب وہ ایک کالونی میں جا کر ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرے اور اُن چیلوں نے لوگوں کو کہنا شروع کر دیا کہ بہت پہنچے ہوئے باوا آئے ہیں اور ان کو دنیا سے کوئی علاقہ نہیں ہے، اتفاق سے وہاں قریب میں ایک مارواڑی رہتا تھا اور اس کی گائے گم ہوگئی تھی تو وہ اس کے پاس آیا کہ حضرت میری گائے گم ہوگئی ہے بتائیے وہ کہاں ہے؟، تو اِس نے یوں اشارہ کیا (حضرت نے یہاں حاضرین کو اشارے کی وہ کیفیت بتلائی) تو وہ چیلے کہنے لگے کہ حضرت یوں کہہ رہے ہیں کہ ادھر ڈھونڈھو وہ ادھر گئی ہے، وہ اُدھر گئے تو اتفاق سے ادھر سے ہی گائے آرہی تھی تو اب وہ پیڑے، لڈو، مٹھائی لے کر پہنچا، اب بڑی شہرت ہوگئی کہ بڑی ہستی آئی ہے اور لوگوں کا ہجوم لگ گیا، تو وہ لوگ وہاں چار پانچ دن رہے ہوٹل میں اور خوب کمائی کی اور بعد میں اس نے کپڑے پہن لیے۔ اور واقعۃً انسانی نفسیات کا یہی حال ہے کہ وہ کوئی اجنبی اور انوکھی چیز کی طرف چلتے ہیں اور وہ لوگ بھی کوئی ایسی چیز کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ان کی طرف لوگوں کا دھیان ہو، اور جو صحیح قسم کا آدمی ہوگا وہ دکانداری پسند ہی نہیں کرے گا، اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ خود لوگوں کے قلوب میں محبوبیت ڈالیں گے، اسے دنیا سے کیا جوڑ، اسی لیے شیخ کی ایک پہچان یہ بھی لکھی ہے کہ اس کے پاس بیٹھ کر آخرت کا دھیان

رہے اور آخرت کا دھیان اسی وقت ہوگا جب وہ آخرت کی بات کرے گا ، اگر دنیا ہی دنیا ہے تو پھر وہ شیخ کیا ہوا یہ تو چالبازی ہے ۔تو سب سے بڑا معیار صحیح العقیدہ ہونا ہے اور اتباعِ شریعت ہے اور پھر یہ کہ کسی محقق شیخ سے اس نے ان چیزوں کو سیکھا ہو(کمالاتِ اشرفیہ) ۔آج ہر لائن میں کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا پروف لاؤ کہ تم نے اسے کہاں سیکھا ہے؟ ڈاکٹر ہے تو ڈاکٹری کا سرٹیفکٹ لاؤ،مگر یہی لائن اتنی سستی ہے کہ صبح نیند سے اٹھے اور شیخ المشائخ بن گئے آج جسے دیکھتے ہیں وہ شیخ بنے بیٹھا ہے،تو شیخ کی پہچان یہ ہے کہ نمبر (۱) صحیح العقائد ہو، نمبر (۲) متبعِ شریعت ہو، نمبر (۳) اس کا رخ آخرت کی طرف ہو(حوالہ بالا) ۔اب آپ دیکھ لیجئے اس معیار پر کہ آخرت کی طرف متوجہ کرتے ہیں یا پلاؤ کی طرف ، چکن کی طرف ، اس کی طرف ، اس کی طرف ، واہیات کی طرف ، چمتکار کی طرف ، کرشمات کی طرف ، ان چیزوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں ،تو شیخ کے اندر وہ اوصاف ہونے چاہئیں جو میں نے اوپر ذکر کئے ، اور وہ بولے تو شریعت کی روشنی میں اگر اول فول بکے تو اس کا اعتبار نہیں ، ورنہ دیہات میں ایک شخص گیا وہ جاہل لوگ تھے اس نے وہاں جا کر لوگوں سے کہا کہ مجھ پر تجلی ہوتی ہے اللہ میاں کی، لوگوں نے کہا کہ ہیں ! تو کہا کہ بالکل رات کے آخری حصہ میں ہوتی ہے، رات کو وہ لوگوں کو ایک جگہ لے گیا اور کپڑے کے اندر ٹارچ جلا کر رکھ دی اور کہا کہ دیکھو اللہ میاں کی تجلی ہورہی ہے وہ بے چارے بھولے بھالے گاؤں کے لوگ کبھی ٹارچ دیکھی نہیں تھی ، اتفاق سے ادھر سے ہمارے چچا کا گذر ہوا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ ان سے زیادہ تجلی ہمارے اوپر ہوتی ہے، کیونکہ ان کے پاس اس سے بڑی ٹارچ تھی ،تو اب بتائیے ! ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، اس لیے شیخ ایسا ہو کہ آخرت کی طرف متوجہ کرے اور یہ کہ کسی سے دین اس نے سیکھا ہو اور صحیح دین اور صحیح فہم پیدا کرواتا ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ رخ اس کا دنیاداروں کی طرف نہ ہو۔

اب آج کا حال دیکھ لیجئے کوئی امیر کبیر متعلق ہو تو اس کو بڑا شرف سمجھتے ہیں کسی پیر سے کوئی سیٹھ صاحب بیعت ہو جائیں، مِل مالک بیعت ہو جائیں تو بہت خوش ہوں گے، بلکہ آج کل تو باقاعدہ اس کی لیسٹ بناتے ہیں ان چیزوں سے شیخ کا کیا تعلق؟ اس کو تو اس سے وحشت ہوگی جس کو ادھر کی دولت نصیب ہو وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہوگا، تو اصل چیز طلب ہے جس کی جتنی طلب ہوگی شیخ کی اس کی طرف اتنی ہی توجہ ہوگی، وہاں میل مالک اور سیٹھ صاحب کو نہیں دیکھنا ہے، اب آپ آج کی دنیا میں ان اوصاف کو دیکھ لیجئے جو میں نے اوپر ذکر کیئے کہ جو شیخِ محقق میں ہونا چاہیے، تو اگر آپ اس کا خیال رکھیں گے تو یہ ساری دکانداری ختم ہو جائے گی۔

خدا کی طلب فطری ہے

اور ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ دیکھئے! خدائے پاک کی طلب فطری ہے۔ اس کی مثال میں ہندوستان میں دیتا ہوں کہ دیکھو! ایک آدمی پہاڑ پر جا کر بیٹھ جائے اور یہ مشہور ہو جائے کہ یہ بہت پہنچے ہوئے باوا ہیں، تو مارواڑی، یہودی، عیسائی، مسلمان، دبلے، سب کا رخ ادھر ہو جائے گا تو اس میں مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں، کیونکہ خدائے پاک کی طلب ایک فطری چیز ہے۔

حضرت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جو بیٹھے گا لوگوں کا ادھر رجوع ہوگا، اگر وہ صحیح ہے تو لوگوں کو نفع ہوگا اور غلط ہے تو نقصان پہنچے گا۔ اور بہت افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ ہم نے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے اپنا جیب بھرا، اپنا پیٹ بھرا اور لوگوں کا دین خراب کیا، یعنی کھا پی کر بھی دین برباد کیا۔ اب آپ بتایئے! اور ایسے ہزاروں واقعات ہیں دنیا میں کہ پیٹ بھرا اور جیب بھرا پھر بھی دین خراب کیا، اس لیے ایسے ہی ایک شخص سے ایک آدمی نے کہا کہ تم یہ جانتے ہو کہ تم جو کر رہے ہو وہ غلط ہے

پھر کیوں ایسا کرتے ہو؟ تو اس نے کرتہ اٹھایا اور کہا اس کے لیے ان نادانوں کو کوئی بتائے کہ کیا تم خدا کا راستہ بتاؤ گے تو غریب ہو جاؤ گے، اس لیے ان چیزوں کو عام کیجئے لوگوں کو بتلائیے یہ ایک عام بلا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کی ایک عام بیماری

میں اپنی تقریروں میں کہتا ہوں کہ ہندوستان میں جب انگریز تھے تو ان کے بنگلے عموماً بستی کے کنارے پر ہوتے تھے اور پھر وہاں تالاب، گارڈن، اور اوپر سے شام کا ٹائم ان کی عورتیں اور بچے اور پھر سفید رنگ اور پردہ وردہ تو کچھ ہوتا نہیں اور جسم کا کافی حصہ کھلا ہوا، تو وہاں جتنے انگریز تھے ان میں دو یا تین فیصد کو جن کا اثر ہوتا تھا، اور یہاں "إن الذین اٰمنوا" کی عورتیں جو ہیں جسے دیکھئے جنات لگا ہے، وہ باہر گئی اور پتہ ہلا اس سے آواز پیدا ہوئی تو کہا کہ "بارنو چھے"، لہٰذا باہر چلو، اب رات کے ڈیڑھ دو بجے کسی عامل کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں، پوچھا کہ کیوں آنا ہوا؟ تو کہا کہ اس کو باہر کا ہوا ہے، یہ سب وہمیات ہیں۔

دیکھو! کافروں کو ہم نے دیکھا ہندوستان میں کہ وہ کسی کام سے جا رہے ہیں، سامنے سے کتا گذر گیا تو واپس آگئے کہ اب کام نہیں ہوگا، تو میں نے کہا کہ چوہے، بلی، کتے کے سامنے سے گذر جانے سے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ اب کام نہیں ہوگا یہ تو کافر کا ارادہ ہے، مؤمن کا ارادہ تو دنیا کی کوئی چیز نہیں توڑ سکتی سوائے خدا کے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "عرفت ربي بفسخ العزائم" تو ارادہ بہت بڑی چیز ہے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا پہاڑ کے ٹوٹنے سے یا مکان کے ٹوٹنے سے، بلکہ فرمایا کہ ارادہ کے ٹوٹنے سے۔ معلوم ہوا کہ مؤمن کا ارادہ بہت بڑی چیز ہے، تو جو چیزیں کافروں کے یہاں

ہوتی ہیں ، اب وہ چیزیں مسلمانوں کے یہاں بھی ہونے لگیں ، تو بڑے افسوس کی بات ہے چونکہ طہارت کا اہتمام نہیں پا کی کا اہتمام نہیں اور پھر ایسی خرافات اور باواؤں کا چکر، یہ اور فلاں اور فلاں یہ سب چیزیں ہیں۔

عملیات کے تماشے

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شیخ صحیح العقیدہ ہونا چاہیے ، ورنہ آج کل یہ بازار بہت عام ہے کہ جس کو دیکھو بزرگ بنا بیٹھا ہے وہ ایک شخص تھے ایک جگہ گئے اور کہا کہ میں بڑا شیخ ہوں اور میرا تقویٰ ایسا ہے کہ میں ایک تعویذ دیتا ہوں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جس کو کوئی خارجی اثر ہوگا اسے تھوڑی دیر میں دست آئیں گے ، تو وہ زعفران کے پانی سے تعویذ لکھتے تھے اور جس کو پلاتے تھے اس کو تھوڑی دیر میں دست شروع ہو جاتے تھے ، بعد میں پتہ چلا کہ وہ روشنائی میں جمال گوٹا ملاتے تھے جس کا یہ اثر تھا۔ تو یہ سب تماشے ہیں ، بزرگیت کے تماشے ، عملیات کے تماشے وغیرہ۔

یہ جوہر ہر ایک کے اندر ہوتا ہے

تو سب سے بڑی چیز ہے صحیح العقائد اور متبعِ شریعت ہونا اور یہ کہ فن اس نے کسی سے سیکھا ہو اور اس کا آخرت کی طرف دھیان ہو تو یہ چیزیں عام کرنے کی ضرورت ہے ، تاکہ لوگ حق اور باطل کو سمجھیں۔ اور دیکھو! ہر آدمی کے اندر یہ جوہر ہوتا ہے کہ وہ اس کو سمجھیں ؛ اس کی مثال یہ دی ہے کہ مکھی جو ہے اس کو معدہ قبول نہیں کرتا اگر بھولے سے بھی وہ اندر چلی گئی تب بھی قے ہو جائے گی ، تو اسی طرح باطل کو قلب قبول نہیں کرتا ، لیکن وہ ملمع سازی کر کر کے اور اگر فطرت ہی مسخ ہو گئی ہو کہ جیسے بعض ملک والے ہیں جو مکھی بھی کھاتے ہیں ، چوہے بھی کھاتے ہیں کہ وہ لٹکے ہوئے ہوتے ہیں ان کے ہوٹل پر ، اسی طرح سانپ بچھو وغیرہ بھی کھاتے ہیں۔ (فیضِ ابرار ج ۱۰ ، ص: ۵۸)

تو شیخ ایسا ہونا چاہیے کہ عقیدہ اس کا صحیح ہو، متبعِ شریعت ہو، اور کسی کے پاس رہ کر اس نے فن کو سیکھا ہو، اور اس کا رخ دنیا داروں کی طرف نہ ہو، اور وہ حق بات بتاتا ہو، اور اس کے پاس بیٹھ کر آخرت کا دھیان ہو، اگر اتنی سی باتیں یاد رہیں تو بس پھر آدمی کسی کے بہکاوے میں نہیں آئے گا۔

مزاح

سوال: ایک صاحب نے پوچھا کہ حضرت لوگ شیخ کے ہاتھوں کو چومتے ہیں وہ کیسا ہے؟
تو حضرت نے مزاحاً فرمایا کہ ہاں بھائی! وہ گھڑی کا کانٹا نو(۹) کے عدد کو چوم رہا ہے اس کا کیا؟ پھر فرمایا کہ اس کا جواب کل دیں گے ان شاء اللہ۔

شیخ سے مناسبت ضروری ہے

اور مشائخِ حقہ سے جو فائدہ لوگوں کو پہنچتا ہے وہ فی حد ذاتہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو ایک ذریعہ بنا کر فائدہ پہنچاتے ہیں، اس لیے شیخ کے انتخاب کے سلسلہ میں یہ قید ہے کہ جہاں وہ متبعِ شریعت اور صحیح العقائد ہو، ٹھیک اسی طریقہ سے اس سے مناسبت بھی ہو۔ (کمالاتِ اشرفیہ)

کتنے ایسے واقعات ہیں کہ کوئی کسی شیخ سے بیعت ہوا، لیکن اس کو شیخ سے نفع نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ وہ مناسبتِ مطلوبہ نہیں تھی، تو خود شیخ نے ہی ان سے کہا کہ آپ فلاں شیخ سے منسلک ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں دکانداری نہیں تھی ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ کوئی اللہ تعالیٰ کا مخلص بندہ طالب بن کر آیا ہے تو اس کو صحیح راستہ بتایا جائے اور مقصود بھی یہی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا۔

تصوف کی انتہاء

اسی لیے فنِ تصوف کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کی انتہا اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا ہے اور ذریعہ اس کا اتباعِ شریعت ہے۔

مقصود تربیت ہے

اور شیخ سے بیعت ہونا اس ذریعہ میں معین ہے مقصود نہیں ہے۔حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اصل شئی تربیت ہے، رسمی طور پر ہاتھ میں ہاتھ دینا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اس لیے بیعت واجب بھی نہیں ہے مقصود تو تربیت ہے، البتہ بیعت ہونا سنتِ مستحبہ ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چوراہے پر ٹرافک پولیس کھڑا ہے، اس کا کام ہے کمان کرنا، اور چلنا جو ہے وہ تو گاڑی والے کو پڑتا ہے، پولیس اس کو اٹھا کر نہیں لے جاتا، اس کا تو کام ہے صرف راہ بتانا، اسی طرح شیخ کی مثال بھی راہنما کی ہے کہ وہ راہنمائی کرتا ہے، لیکن اگر مرید اس کے رہنمائی کے تقاضے پر عمل نہ کرے تو نفع خاطر خواہ نہیں ہو سکے گا، بلکہ لکھا ہے کہ ایک نفع شیخ کی صحبت کا ہے جو اس کے پاس رہنے سے وقتی طور پر ہوتا ہے اور ایک اس کی اطاعت سے اور کثرتِ ذکر سے انسان اپنے اندر حرارت پیدا کرے وہ نفع ہے۔اور دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے آدمی آگ جلا کر اس کے سامنے بیٹھ جائے تو جب تک آگ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے حرارت معلوم ہوگی، اس کے سامنے سے ہٹ گیا تو حرارت معلوم نہیں ہوگی۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ٹانک استعمال کرے اب اس کے نتیجہ میں جو حرارت پیدا ہوگی اس کے اندر وہ برفیلے علاقہ میں بھی اس کو نفع دے گی، اس لیے کہ گرمی اس کے اندر پیوست ہو چکی ہے، تو شیخ کی صحبت کے ساتھ ساتھ جب تک اس کی تعلیمات پر عمل

نہ ہوتب تک معتد بہ نفع نہیں ہوتا، اس لیے کرنا اور چلنا تو سالک کو ہے اور سالک تو کہتے ہی ہیں چلنے والے کو، وہ چلتا رہے تو سالک ہے، رُک جائے تو واقف ہے، واپس آجائے تو راجع ہے، اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چلے ہیں حضرت خضر کی طرف تو فرمایا کہ ﴿ وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتَاهُ لَآ أَبْرَحُ حَتّٰىٓ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُباً ۝ ﴾ (سورۂ کہف، آیت نمبر: ٦٠) کہ ''برابر میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ مجمع بحرین میں پہنچوں جو مکان ہے حضرت خضر علیہ السلام کا''۔

اس سے صوفیہ مستنبط کرتے ہیں کہ سالک کی جب تک تکمیلِ نسبت نہ ہو بس لگا رہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تکمیل کے بعد تھک کر بیٹھ جائے، کیونکہ حق تعالیٰ کے قرب کی تو کوئی انتہاء ہے ہی نہیں، تو چلنا اسی کو پڑتا ہے، اسی لیے شیخ کی مثال یہ بھی دی ہے کہ، مثلاً ایک لڑکی ہے اس کی شادی ہوگئی تو اس کی جو سہیلیاں ہیں ان کا کام ہے اس کو نہلا دُھلا کر اور آراستہ کرکے دولہے کے کمرے تک پہنچا دینا۔ اس کے بعد اب براہِ راست بیوی کا معاملہ اپنے شوہر سے ہے۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت)

اب جب کمرے میں پہنچا دیا تو ظاہر بات ہے کہ وہ جو سجانے والی تھی وہ تو وہیں رہی اب اس کا اصل معاملہ اپنے شوہر کے ساتھ ہے، اسی طرح ہر آدمی کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ ہے، شیخ کا کام اتنا ہوتا ہے کہ وہ مرید کے باطن کو آراستہ کرتے ہیں، اب براہِ راست اس کا معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، چونکہ شیخ اس کو رب تک پہنچانے کا ذریعہ بنا ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ تکمیل کے باوجود وہ شیخ سے رابطہ رکھے وہ شیخ سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ ہاں! یہ الگ بات ہے جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بعض مرتبہ مرید پر توحید کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ پھر اسے اپنے شیخ سے بھی بے نیازی معلوم ہوتی ہے کہ جو مقصود تھا وہ حاصل ہوگیا اور اصل یہی ہے شیخ سے تو بس ایک قسم کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔

بیعت کی حقیقت

اور بیعت کی حقیقت بیع ہے اور بیع کے معنی ہیں بیچنا، تو گویا مرید اپنے کو شیخ کے ہاتھوں بیچ رہا ہے، مگر وہ جو اپنے کو شیخ کے حوالے کر رہا ہے وہ صرف دینی نقطۂ نظر سے ہے اور مقصد رضائے حق ہے، اور اگر شیخ اس سے دنیا کمانے کا سوچ رہا ہے تو پھر وہ خواب والی مثال مشہور ہے کہ ایک مرید نے خواب دیکھا تو شیخ سے اپنے خواب کو بیان کیا کہ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں نجاست لگی ہوئی ہے اور آپ کے ہاتھ میں شہد لگا ہوا ہے، تو شیخ کہنے لگے کہ ہاں ہاں! تم دنیادار ہو اور میں طالبِ آخرت ہوں، تو تم نے ایسا ہی دیکھا ہوگا تو وہ کہنے لگا کہ حضرت ابھی خواب پورا نہیں ہوا ہے میں نے دیکھا کہ آپ میرا ہاتھ چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کا ہاتھ چاٹ رہا ہوں تو وہ کہنے لگے کہ " لا حول و لا قوة إلا بالله " ۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت)

اصل میں خواب کی تعبیر یہ تھی کہ مرید تو شیخ سے دینی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور شیخ مرید سے دنیا بنانا چاہتا تھا اپنی ۔ ظاہر بات ہے کہ جب مقصود اس کا دنیا ہے تو وہ شیخ کیا ہوا مسخ ہوا، اس لیے لکھا ہے کہ اس کے پاس بیٹھ کر آخرت کی طرف دھیان ہو، اس کے پاس آخرت کا تذکرہ ہو، اور اگر وہ دنیا کے چکر میں ہے تو پھر وہ بیعت ہی کیا؟ تو شیخ کی تلاش میں تو تحقیق کرے، لیکن جب بیعت ہوجائے تو اب تقلید سے کام لے، اسی لیے ہر ایک کے ہاتھ میں ہاتھ دینا بھی مناسب نہیں، اس لیے اس میں جلدی نہیں کرنا چاہیے، یہ سودا ایسا نہیں ہے کہ جذبات پر اس کی بنیاد ہے، بلکہ اس کے پاس دین کی فہم ہو، آخرت کی طرف دھیان ہو، متبعِ شریعت ہو، لوگوں کو اس سے نفع ہوتا ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر دنیا داری ہے، جیسا کہ آج کل چل رہا ہے ۔ اس وقت تو حالت یہ ہوگئی ہے کہ شیخ کو ہی صحیح دین کا فہم نہیں ہوتا، کیونکہ وہ صحیح شیخ تو ہوتے نہیں وہ تو صورت ان کی اختیار کرلی

جاتی ہے کہ بڑا جبہ پہن لیا، بال لمبے لمبے کر لیے، ہاتھ میں تسبیح لے لی، تو اس سے محقق ہونا لازم نہیں آتا، سب سے بڑا میزان وہ شریعت ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ چاہے وہ ہواؤں میں اڑتا ہو یا پانی پر بہتا ہو، مگر شریعت کا اتباع نہیں ہے تو مردود ہے۔ ہاں! کوئی شخص مغلوب الحال ہے تو الگ بات ہے جیسا کہ جذب میں ہوتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ سے کسی نے کہا کہ حضرت! ایک آدمی ہے نماز روزہ وغیرہ کچھ بھی نہیں، مگر وہ پہنچے ہوئے ہیں تو حضرت نے فرمایا کہ ہاں! مگر کہاں پہنچے ہوئے جہنم میں، تو شریعت کا اتباع یہ میزان ہے اور مقصود رضائے حق ہے، اسی لیے بیعت ہونے سے پہلے اپنی حالت دیکھ لیں کہ اس سے خواب اور کشف وکرامت تو مقصود نہیں یا اس سے ایک خاص قسم کی حرارت یا لذت تو مقصود نہیں ہے یا دکان وتجارت کی برکت تو مقصود نہیں ہے، اس سے مقصود صرف ایک چیز ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔
(معارفِ بہلوی)

شیخ سے مدد کیسے ملتی ہے

اور ذریعہ اس کا شیخ ہے، اب شیخ سے مدد کیسے ملتی ہے؟ تو مرید کو جو حالات پیش آویں اس کو اپنے شیخ سے بیان کرے (کشکولِ معرفت ص:۱۲۷)۔ شیخ کو اپنا حال اور اپنا مرض بتانا ضروری ہے، تا کہ وہ اس کے علاج کے لیے نسخہ تجویز کرے اور جیسے طب کی کتاب اطباء کے لیے ہے مریض کے لیے نہیں ہے، اسی طرح تصوف کی کتابیں بھی شیخ کے لیے ہیں مریدوں کے لیے نہیں ہیں، جب تک کہ ماہر نہ ہو جائے (انفاسِ عیسی ص:۶۲) اس میں ایک بات دھیان میں رہے کہ بعض مرتبہ آدمی کی زندگی گناہوں سے پُر ہوتی ہے، مثلاً بدنگاہی کی عادت ہے تو لکھتے ہیں محققین کہ یہاں مقصد گناہ کو دور کرنا ہے، جیسے ستر ہے شرمگاہ ہے اس کو مریض ضرورۃً ڈاکٹر کے سامنے کھولتا ہے علاج کے لیے، تو جیسے اس کی اجازت ہے، اسی طرح یہاں بھی اس کے بیان کرنے کی اجازت ہے (حوالہ بالا، ص:۳۴)

اور شیخ محقق ہوگا تو وہ حالات کو سن کر اس کو حقیر نہیں سمجھے گا، شیخِ محقق بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی حقیر نہیں سمجھے گا اور اس کے ساتھ معاملہ نفرت کا نہیں کرے گا۔ ہاں! وہ گناہ کو تو بُری نگاہ سے دیکھے گا، مگر گنہگار کو بُری نظر سے نہیں دیکھے گا، بلکہ اس کے لیے دعا کرے گا۔ اور اگر وہ صاحبِ توجہ ہے تو اس کی طرف توجہ بھی کرے گا، اب توجہ کی حقیقت کیا ہے؟ وہ ایک مستقل موضوع ہے۔

تو غرض یہ کہ یہ شکل ہے، تو شیخِ محقق سے اپنے امراض بتلا دینا یہ مطلوب ہے تو پہلے نمبر پر ان کو اپنے حالات کی اطلاع کرے پھر اس پر وہ جو کچھ کہے لکھے اس کی اتباع کرے اور اس پر انقیاد و اعتماد کرے تو پھر نفع ہوگا۔

خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمہ اللہ نے اس کو منظوم کر دیا، فرماتے ہیں کہ...

استفادہ کے لیے ہے چار شرطیں لازمی
اطلاع واتباع وانقیاد واعتماد
یہ مقفّٰی قول ہے رنگین بھی سنگیں بھی
حضرت مرشد کا یہ ارشاد رکھ تا عمر یاد
اطلاع واتباع وانقیاد واعتماد

تو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ رسمی بیعت ہوگئے کہ شیخ خدا جانے کہاں اور یہ کہاں، نہیں، بلکہ شیخ کو اپنی حالات کی خبر دے جیسے مریض ڈاکٹر کو اپنے مرض کی خبر دیتا ہے۔

وظائف مقصود نہیں ہے

اب قصہ کیا ہوگیا ہے کہ لوگوں نے خالی وظیفہ کو مقصود سمجھ لیا ہے، حالانکہ وہ مستحب ہے اور ذریعہ ہے وصول اِلی اللہ کا (معارفِ بہلوی ج ۳، ص:۳۲۳) اسی لیے جو محقق شیخ ہوگا وہ سب کچھ دیکھے گا، یہاں تک کہ اس کا مشغلہ کیا ہے وہ بھی دیکھے گا، جیسے طب میں

یہ ہوتا ہے کہ دو مریض ہیں اور دونوں کی بیماری یکساں ہیں، مگر پیشہ الگ ہے کہ ایک لوہار ہے وہ ہر وقت بھٹی کے سامنے رہتا ہے اور ایک دھوبی ہے جو ہر وقت پانی کے سامنے رہتا ہے تو اس کا بھی لحاظ ہوگا، تو اگر وہ صحیح شیخ ہے تو وہ دیکھے گا کہ اس کی صحت بھی وظائف کے لیے ساتھ دیتی ہے یا نہیں؟ یہ نہیں کہ وہ کمزور ہے اور نیند اس کو آتی نہیں تو کہہ دیا کہ روزانہ ہزار تسبیح پڑھا کرو تب تو اور صحت اس کی خراب ہوگی، تو شیخ اگر محقق نہیں ہوگا تو یہ سب ہوگا، اسی لیے بعض کو تو مشائخ نے کہا کہ صرف آپ تسبیح فاطمی پڑھ لیا کرو اور دو چار رکعت نفل پڑھ لیں اس کے ساتھ، کیونکہ وہ مشغول آدمی ہے۔

حضرت مولانا سعید احمد صاحب رحمہ اللہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے تو حضرت نے فرمایا کہ جتنی دیر آپ مسلم شریف کے مطالعہ میں لگاؤ گے تو وہی ذکر کے قائم مقام ہو جائے گا، کیونکہ حضرت مولانا سعید احمد صاحب رحمہ اللہ مسلم شریف پڑھاتے تھے۔ اور حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے مجھے خط میں لکھا کہ درسِ حدیث اور مطالعہ یہ روح الاذکار ہے، یہ چیزیں جو محقق شیخ ہیں وہ سمجھتا ہے، مثلاً ایک آدمی ہے وہ بچوں کو چار چھ گھنٹے پڑھاتا ہے تو اب وہی اس کا ذکر ہے، اب آپ اس کو لمبی چوڑی تسبیح بتائیں تو پھر کیا ہوگا؟ اسی لیے فارغ آدمی کے وظائف اور ہے اور مشغول آدمی کے وظائف اور ہوں گے، تو شیخ محقق ہوگا تو وہ اپنی بصیرت سے ہر ایک کے مناسب اس کو چیز بتائے گا، اس میں کیا ہوگا کہ نہ دین بدنام ہوگا اور نہ تو تصوف بدنام ہوگا۔ اور اگر سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکو تو وہ تو جہالت کی بات ہے، اسی لیے تو لکھا ہے کہ اگر مرید کو شیخ سے مناسبت نہیں ہوگی تو شیخ خود اس کو بتلادے گا کہ آپ کسی اور سے بیعت ہو جائیں، کیونکہ وہاں کوئی دنیا جمع کرنا تو مقصود ہے نہیں اور اگر وہ ایسا نہیں ہے تو وہ شیخ ہے ہی نہیں، صرف اس نے وہ لباس پہن رکھا ہے، اس لیے اپنے گھر کی عورتوں کو بھی سمجھاؤ کہ سب سے بڑا معیار کتاب وسنت ہے۔

اتباع پیغمبر کا کیا جائے گا

ہاں! اگر کوئی مغلوب الحال ہے تو اس کو برا بھی نہیں کہیں گے، لیکن اس کا اتباع بھی نہیں ہوگا، جیسے رابعہ بصریہ رحمہا اللہ ایک مرتبہ ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لے کر نکلیں کہ ایک سے جہنم کو بجھادوں اور دوسرے سے جنت کو جلادوں کہ لوگ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت کریں۔ (رسالہ قشیریہ،خزینہ،ص۲۶۳)

تو وہ ایک حال تھا ان پر اس وقت، لہٰذا یہ مغلوبیت ہے تو ہم ان کی مذمت بھی نہیں کریں گے، لیکن اتباع بھی نہیں کریں گے، اتباع تو کیا جائے گا پیغمبر کا، تو ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا جائے گا، ورنہ ہوتا کیا ہے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھ لیا، اب وہ اپنے کو کامل سمجھتا ہے، کسی کو گرمی آ گئی کسی کو کچھ دھیان جم گیا، اب وہ اپنے کو کامل سمجھ رہا ہے یہ سب کچھ نہیں ہے، سب سے بڑا کمال عبدیت ہے، ورنہ دیکھئے ابلیس کا کیا حال ہوا؟ تو عبدیت سب سے بڑی چیز ہے کہ آدمی اپنے کو کچھ نہ سمجھے اور اللہ تعالیٰ کے آگے گڑگڑائے، اور اگر یہ چیز نہیں ہوئی تو معلوم ہوا کہ ابھی جان نہیں پڑی۔

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ عبادات جاندار ہوگی تو اخلاق متأثر ہوں گے یہ ان کا نظریہ تھا۔ (فیضِ ابرار ج۱۰،ص:۲۷۹)

اور دوسرے حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاق کی اصلاح ہوگی تو عبادات میں جان پڑے گی۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، حصہ ہفتم)

دونوں حیثیتیں ہیں " ولکل وجھة " تو شیخ کی تجویز کے معاملہ میں جلدی نہیں کرنا چاہیے اور دارومدار اتباعِ سنت پر ہے۔

دو طبقے ہیں ایک سے نفع اور دوسرے سے نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے

دیکھئے! صوفیاء سے اسلام کو جہاں بہت نفع پہنچا ہے وہیں پیٹ پرست پیروں سے نقصان بھی بہت پہنچا ہے۔تو ایسے شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دیں جو حقیقت کو سمجھا ہوا ہو اور کسی محقق کے پاس رہ کر اس نے فن سیکھا ہو، خالی کتاب دیکھ کر نہیں، اسی لیے ڈاکٹر لوگ ڈگڑی لینے کے بعد بھی باقاعدہ پریکٹس کرتے ہیں کہ ذرا ہاتھ صاف ہو جائے اور خدا کا راستہ ہی لوگوں نے اتنا آسان اور گیا گذرا سمجھ لیا ہے کہ جسے دیکھو وہ واثق باللہ اور عارف باللہ بنا بیٹھا ہے،تو یہ چیز ہے بنیادی اور اس کی اگر آدمی کو سمجھ پیدا ہوگئی تو وہ کبھی دھوکہ نہیں کھائے گا۔

شیخِ محقق مایوس نہیں کرے گا

توان حضرات کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کو کھولا اور جو بڑے لوگوں کے حالات کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اب مرید اس کو پڑھے گا تو اپنی حالت کو دیکھ کر مایوس ہوگا کہ ان کے حالات کیا تھے اور میری حالت کیا ہے،لیکن شیخ اگر محقق ہوگا تو وہ مایوس نہیں کرے گا۔اس کی میں مثال دوں آپ کو، ایک غریب آدمی ہے اور اس کے پاس پانچ سو روپئے ہیں ، اب اس کو کچھ کام کرنا ہے ، اب کوئی اس کے سامنے بڑے بڑے کروڑ پتیوں اور فیکٹریوں کے مالکوں کا قصہ سنائے تو وہ تو بیچارہ پریشان ہوجائے گا، اب اگر کوئی عقلمند ہے تو وہ کہے گا کہ وہ ان کی سطح ہے تم اپنی سطح پر کام کرو، کوئی یہ سوچے کہ میں ایک ہفتہ میں ایک کروڑ کی آمدنی کروں اور جیب میں ہے پانچ سو روپئے ہے تو یہ کیسے ہوگا؟ وہ ایک صاحب دکان پر گئے وہاں کچھ سکّے پڑے ہوئے تھے تو انہوں نے

جیب میں سے ایک روپیہ نکالا اور اس پر ڈالا تو دُکان والے نے پوچھا کہ یہ کیا کیا ؟ وہ کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے کہ پیسہ پیسہ کو کھینچتا ہے تو میں اس کا انتظار کر رہا ہوں ، تو دُکان والے نے کہا کہ تم نے بالکل صحیح سنا ہے ، چونکہ سکّے ادھر بہت زیادہ تھے تو انہوں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا تو اب کچھ نہیں رہا اس کے ہاتھ میں کہ جو تھا وہ بھی گیا۔

(خطبات حکیم الامت ج ۵ ،ص: ۲۵۰)

وہ ایک بنیے نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک آدمی سے سود پر جھگڑ رہا ہے ، وہ کہہ رہا ہے کہ میں ایک روپیہ دوں گا بنیا کہہ رہا ہے کہ میں دو روپیہ لوں گا گرما گرمی ہوئی تو آنکھ کھل گئی تو اس نے سوچا کہ دو بھی گیا اور ایک بھی تو اس نے فوراً آنکھ بند کر لی اور کہنے لگا کہ چلو ایک روپیہ ہی دے دو، تو اب وہ کہاں سے آئے گا ایک روپیہ تو سب سے بڑی چیز یہی ہے تو اس میں آدمی لگے گا اور کچھ کرے گا تو خود نفع محسوس کرے گا ، کیونکہ اس دنیا میں آپ دیکھیں گے کہ بیشتر کام اللہ تعالیٰ نے اسباب کے ماتحت رکھے ہیں۔

دیکھئے !اللہ تعالیٰ اس پر قادر تھے کہ دلوں میں ہدایت پیدا کر دیتے ،مگر کتابیں بھیجیں ، نبیوں کو بھیجا ، پھر ان کو حالات سے گذارا گیا سب کچھ کیا گیا ،تو یہ ذریعے اور اسباب ہیں۔ تو شیخ کے متعلق میں کہہ رہا تھا کہ مشائخ مستقل نہیں ہے ، بلکہ مشائخ کے حق ہونے کا معیار شریعت ہے ، اگر کوئی شخص ہے کہ اس کو کشف بہت ہوتا ہے تو کشف تو کتے کو بھی ہوتا ہے وہ معیار نہیں ہے ،تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ شیخ محقق ہوگا تو وہ مایوس نہیں کرے گا۔

ولی بننے کا نسخہ

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ولی کیسے بن سکتے ہیں ؟ تو بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس فتنے کے زمانہ میں جو نفع پہلے زمانے میں لوگوں کو پچیس سال میں ہوتا تھا وہ دو سال میں ہوگا کہ آج دینی اعتبار سے موانع اور فتن بہت زیادہ ہیں اور جتنی رکاوٹیں ہوں گی

اتنا ہی کام دشوار ہوگا، تو یہ چار چیزیں بہت زیادہ ضروری ہیں۔اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سفر میں بیعت کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔(مجالس الحکمۃ ص: ۱۳۸)

کیونکہ اس میں کیا ہوتا ہے کہ چلو مولوی صاحب آئے ہیں تو ہاتھ ملالو، اب ایک نے ہاتھ دیا تو اس کو دیکھ کر دوسرا پھر تیسرا، اس طرح ایک سلسلہ چل پڑتا ہے، تو یہ کام بصیرت کے ساتھ کرنا ہے، سوچ سمجھ کر یہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے، تو وہ شعر یاد کر لینا چاہیے کہ...

استفادہ کے لیے ہے چار شرطیں لازمی
اطلاع واتباع وانقیاد واعتماد
یہ مقفّٰی قول ہے رنگین بھی سنگین بھی
حضرت مرشد کا یہ ارشاد رکھ تا عمر یاد
اطلاع واتباع وانقیاد واعتماد

اس لیے جو صحیح سلوک ہے وہ شریعت کی ترجمانی کرے گا حقوق بتلائے گا کہ نہ بیوی بچوں کے معاملے میں گڑبڑی ہوگی نہ کاروبار میں اور وہ شریعت کی صحیح تعلیم دے گا اور ایک خاص انداز سے آدمی کو لے چلے گا، اور یاد رہے کہ اس سے مقصود صرف رضائے حق ہے۔اور اگر ایسا نہیں ہے تو برسوں چکر مارتے رہیئے کچھ نہیں ہوگا، یہ راستہ وہ ہے کہ ہزاروں سال اگر غلط طریقہ سے چلے گا تو کامیابی نہیں ہے اور طریقہ صحیح ہے اور فضل ہوگیا تو منٹوں میں ہزاروں سال کا راستہ طے ہوجائے گا۔

تو بیعت سے مقصود کوئی ہاتھ میں ہاتھ دینا نہیں ہے، بلکہ اس میں شیخ سے شریعت پر چلنے میں مدد ملتی ہے، اس لیے اگر بیعت نہیں ہوا رسماً، لیکن شریعت پر چل رہا ہے تو کامیاب ہے، البتہ ترقی کرنے کے لیے راہبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ہر لائن میں ہوتا ہے۔

لوگوں نے مقصود ہی کو نہیں سمجھا

اس لیے اس وقت جو گڑ بڑی ہے وہ یہی ہے کہ لوگوں نے مقصود ہی کو نہیں سمجھا ہے، اس میں تو طالب کی وقعت ہونا چاہیے نہ کہ ہدیہ کی کہ مقصود آخرت ہے، یہ نہیں کہ کوئی پیسہ والا آگیا تو اس کی طرف متوجہ ہوگئے تو پھر یہ شیخیت کیا ہوتی، یہ تو دنیا داری ہوئی تو اصل مقصد تعلق مع اللہ ہے اور اس میں معین دعاء ہے۔

تعلق مع اللہ کی ضرورت ہے

ہمارے حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے انتقال سے چھ مہینے پہلے مسلسل دعاء پر بیان کیا اور فرماتے تھے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے کتنی دعائیں مانگیں، اگر آدمی اللہ تعالیٰ سے مانگنے والا بن جائے تو اس کی ساری ضرورتیں پوری ہوجائیں، اور غیروں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے، تو اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ صحیح کریں گناہ ہوجائے تو توبہ کرلے، نفس وشیطان نہیں مانتے تو آپ بھی نہ مانیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ اس کے ساتھ تو زندگی بھر کی کشتی ہے، کبھی ہم اس کو پچھاڑیں گے، کبھی وہ پچھاڑے گا۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بیٹھے گا چین سے اگر	☆	کام کے کیا رہیں گے پر

کہ پرندہ اگر پنجرے میں چین سے بیٹھا رہے تو اس کے پر بے کار ہوجاتے ہیں اور وہ پھر وہ زیادہ نہیں اڑ پاتا کہ...

بیٹھے گا چین سے اگر	☆	کام کے کیا رہیں گے پر
گو نہ نکل سکے مگر	☆	پنجرے میں پھڑ پھڑائے جا

یہ روح سے خطاب ہے کہ ابھی تو نکلی نہیں، مگر اپنے اندر خدا سے ملنے کی بیقراری

پیدا کر تو نکلنے کا وقت جب آئے گا تو پہنچنے میں مزہ آئے گا، تو بس یہ طے کرلیں آپ حضرات کہ ہم کو اپنے خدا سے تعلق صحیح کرنا ہے ہم لاکھ گنہگار صحیح۔

دیکھو!ایک مثال دوں میں آپ کو کہ ماں جو ہے اپنے بیٹے سے چاہے وہ کالا ہو، لنگڑا ہو، اندھا ہو، بہرا ہو، کچھ بھی ہو، لیکن اس کے باوجود ماں اسے اپنا سمجھتی ہے اور وہ ماں کو اپنا سمجھتا ہے، کچھ ہوگا تو میرا لال، میرا منّا، میرا جگر وغیرہ، تو ٹھیک اسی طریقہ سے ہم نے اگر اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرلیا اور ہم نے اللہ تعالیٰ کو اپنا سمجھا تو ہم لاکھ گنہگار صحیح، اللہ تعالیٰ بھی ہمیں اپنا سمجھیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کے ہوگئے تو پھر " فزت ورب الکعبة " اور اس کے لیے دیکھو میں ایک کام کی بات بتادوں، بزرگانِ دین جو ہوتے ہیں ان کے کوئی سرخاب کے پر نہیں ہوتے وہ ہماری طرح ہی ہوتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے حالات میں ہے کہ آپ کے رمضان اور غیر رمضان کے معمولات میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا (ملفوظاتِ حکیم الامت حصہ اول، ص: ۳۰۴) ہمیشہ مصروف رہتے تھے، اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جب معرفت پیدا ہوجاتی ہے تو پھر اس کی ہر شئی عبادت بن جاتی ہے۔

دیکھو! دو آدمی کھانے بیٹھے ایک ویسے ہی کھا رہا ہے اور دوسرا کھانے کی ساری سنتوں کا لحاظ کر کے کھا رہا ہے اور وہ کھاتے ہوئے یہ سوچتا ہے کہ اللہ میاں کی مجھ پر کتنی نعمتیں ہیں اور میں اس کا کتنا نافرمان بندہ ہوں، یہ سوچتے ہوئے کھا رہا ہے تو اب آپ دیکھئے کہ کھا دونوں ہی رہے ہیں، مگر وہ اندر ہی اندر ترقی کر رہا ہے یہ فرق ہے، اسی لیے بعضوں نے تو لکھا ہے کہ اخلاصِ نیت یعنی ہر عمل میں اپنی نیت ٹھیک کرو تو مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا اور ثواب دھنا دھن شروع ہو جائے گا۔

بس یہ کرنا ہے کہ خدا سے اپنا معاملہ صحیح ہوجائے پھر دیکھئے حالات کیسے بدلتے ہیں، اور یہ بھی یاد رکھیں کہ خدا سے معاملہ ٹھیک ہوجانے کے بعد اگر مشکلات آئیں بھی جیسے کہ

انبیا کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر آئیں، تو وہ ایسے ہی ہے کہ پھر اس میں ایسی لذت آتی ہے، جیسے مرچی والا بھجیا کہ تکلیف میں بھی لطف ہے۔

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے	☆	تو ہو کے ترش رو مجھے گالی ہزار دے

تو اللہ تعالیٰ سے معاملہ صحیح ہوگیا تو پھر مزہ ہی مزہ ہے تو قدم قدم پر دعا کی عادت ڈالے پھر دیکھئے کیا ملتا ہے۔

ایک انگریز مسلمان ہوا، اس سے پوچھا گیا کہ تو نے کیوں اسلام قبول کیا؟ تو اس نے کہا کہ اسلام ایسا دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ڈابھیل کے قریب اونبھراٹ ایک جگہ ہے وہاں پانی میں ایک کشتی چٹان سے ٹکراگئی اور ڈوبنے کے قریب ہوگئی تو اس میں بیٹھے لوگوں نے گڑگڑا کر دعا اور ذکر شروع کیا تو وہ دھیرے دھیرے اوپر آنا شروع ہوئی اور ڈوبنے سے بچ گئی۔ (فیضِ ابرار ج ۱۰، ص: ۴۲)

تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ جو ہیں بس لگے رہیں اس میں، اگر ظاہری طور پر ہم ذکر و دعا میں مشغول نہ ہوسکیں تو قلب کو اس میں لگائے رکھیں، بزرگوں نے نسبت کی مثال دی ہے کہ جیسے ڈاڑھ کا درد، اور ڈاڑھ کے درد میں ہوتا یہ ہے کہ سب کام ہو رہے ہیں، مگر ذہن ادھر ہی لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کو سمجھنے اور پھر ان پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔آمین

مجلس نمبر (۴)

زندگی چار عمل سے عبارت ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس نمبر (۴)

آدمی کی چار حالتیں ہوتی ہیں

آدمی کی چار حالتیں ہوتی ہیں: ایک راحت کی دوسری تکلیف کی، یہ مادی اعتبار سے ہے، اور اس سے ہٹ کر دو حالتیں اور ہیں: ایک ہے طاعت یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی اور دوسری ہے معصیت کی، تو ان چار میں سے آدمی پر کوئی بھی دو حال ہوتے ہیں: یا تو وہ نعمتوں میں ہے حق تعالیٰ کی طرف سے یا زحمتوں میں ہے، اور یا تو طاعت کی حالت میں ہے یا معصیت کی حالت میں ہے۔ (معارفِ بہلوی ج ۳، ص: ۴۲۶)

شکر کی تین قسمیں ہیں:

اگر انسان نعمت میں ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ شکر گذار ہو (حوالہ بالا ص: ۴۲۷) اور شکر کی حقیقت کیا ہے وہ بھی سمجھنے کی بات ہے۔

عام طور پر لوگ شکر اس کو سمجھتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھالیا اور ڈکار لیتے ہوئے کہا شکر الحمد للہ۔ ویسے یہ بھی شکر ہے اس کی نفی تو نہیں کی جاسکتی کیونکہ شکر کی ایک قسم شکرِ لسانی بھی ہے کہ آدمی نے کھانا کھانے کے بعد یا نیا کپڑا پہننے کے بعد دعا پڑھی تو یہ شکرِ لسانی ہے، اور اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ بندے اس کا شکر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا کہ ﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُم ﴾ (سورۂ نساء، آیت نمبر: ۱۴۷) کہ ''اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم ایمان لاؤ اور شکر کرو'' ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾ (سورۂ نساء، آیت نمبر: ۱۴۷) یہاں شاکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ بندوں کا شکر یہ ادا کرتا ہے، بلکہ یہاں اس سے قدر دان مراد ہے یہ ترجمہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔

اور نعمت کی قدر تین طریقے سے ہوتی ہے: نمبر(۱) زبان سے، نمبر(۲) افعال سے، نمبر(۳) قلب سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے کھانا کھا کر کہا الحمد للہ تو اس نے شکر ادا کیا، مگر یہ زبان سے شکر ہوا اور قلب میں بھی اگر یہی کیفیت ہے تو وہی شکرِ قلبی بھی ہو جائے گا اور شکرِ عملی یہ ہے کہ کھانا کھانے کے بعد جو قوت حاصل ہوتی ہے اسے گناہوں کے بجائے طاعات میں خرچ کرنا۔

دیکھیں! آنکھ ایک نعمت ہے تو اب اس کا شکر یہ ہے کہ اس سے قرآن شریف پڑھے عبرت کی نظر ڈالے مباح کاموں میں استعمال کرے اگر اس کو گناہ کے کاموں میں استعمال کیا، تو وہ نعمت کی ناشکری کہلائے گی، یہی حال کان زبان وغیرہ اعضاء کا بھی ہے، تو شکر کا دائرہ محض زبان کی حد تک محدود نہیں ہے۔

انسان پر ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی نعمت برستی ہے

اور انسان پر کوئی حال بھی ایسا نہیں گذرتا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نعمت نہ برس رہی ہو اگر وہ بیٹھا ہے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، کیونکہ وجود تو اسے ہر وقت مل رہا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے چراغ کہ اس کو ہر وقت تیل ملتا رہتا ہے جبکہ اس کے ساتھ تیل بتی لگی ہوئی ہو تو چراغ اس تیل بتی کے ذریعہ جلتا ہے اور جہاں جو حصہ جل جاتا ہے فوراً اسی مقام پر دوسرا آگیا، اور یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے کہ جلتا رہا، آتا رہا، جلتا رہا، آتا رہا، یہ اتنی عجلت اور اتصال سے ہوتا ہے کہ اس میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا، مسلسل معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ مسلسل نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ وہ نیچے کا تیل ختم ہوتا جاتا ہے تو ادھر جلا ادھر آیا اس کا نام تجددِ امثال ہے۔ ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ادھر فنا ہوا ادھر آیا کہ ہم پر ہر وقت فنا طاری ہے، مگر اسی آن حق تعالیٰ کی طرف سے وجود کا فیضان ہے، جب یہ تسلسل ہے تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ بیچ میں عدم ہے، اسی کا نام تجددِ امثال ہے۔
(فیضِ ابرار ج۹، ص: ۲۵۹)۔

تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ کوئی گھڑی ایسی نہیں ہے جس میں انسان کو وجود نہ مل رہا ہو اور جب مسلسل وجود مل رہا ہے اور یہی وجود یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی کہ معدوم ہو گئے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نعمت کا تو وجود یہ سب سے بڑی نعمت ہے ،تو شکر کے تین درجے ہوئے ۔

اس عالم میں مشکلات کا ایک بڑا سلسلہ ہے

اور اگر آدمی مصیبت میں ہے تو پھر صبر کرے (معارفِ بہلوی: ۴۲۷) اور ظاہر بات ہے کہ آدمی پر حالات تو آتے ہی ہیں اور اس شان سے آتے ہیں کہ اس سے مفر نہیں ہوتی ۔

حضرت آدم علیہ السلام کا جب خمیر تیار ہوا تو بعض آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتالیس دن غموں کی بارش ہوئی اُن پر اور ایک دن خوشی کی بارش ہوئی۔

(تفسیرِ عزیزی سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۳۰۶)

اب اس آثار پر محدثانہ اعتبار سے کلام ہے ،مگر یہ کہ اس سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ اس عالم میں مشکلات کا ایک بڑا سلسلہ ہے ،اور قرآنِ کریم میں بھی ہے ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ٥ ﴾ (سورۂ بلد، آیت نمبر: ۴) ”یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا فرمایا“ اور قرآنِ کریم نے ایک مقام پر فرمایا کہ ﴿ يٰأَيُّهَا الإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلٰى رَبِّكَ كَدْحاً فَمُلٰقِيْهِ ٥ ﴾ (سورۂ انشقاق، آیت نمبر: ٦) تو کبھی ابتلاء ہے مصیبت ہے ، بیماری ہے ،ضعف ہے ، مخالفت ہے ، اسی طرح تشویشات ماضی کا غم مستقبل کی فکر وغیرہ ، ایسی کیفیت ہے کہ اٹھتے بیٹھتے نہ کام سے کام والی بات ہے کہ ...

وہ محرومِ تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے
کہ جو منزل بمنزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

تو حالات انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور ہر تکلیف کا حل اس کے مناسب صبر ہے اور صبر جو ہے بہت بڑی چیز ہے۔ بات یہ ہے کہ نفس ہونا چاہتا ہے بے قابو اور صبر کی حقیقت ہے حبس النفس، اور پھر صبر کی بھی تین قسمیں ہیں: (۱) صبر علی الطاعۃ (۲) صبر عن المعصیۃ (۳) اور صبر علی المصیبۃ (مختصراً کنز العمال ج ۳، ص: ۲۷۳)۔ تو کوئی نہ کوئی حالت انسان کو ناگواری کی پیش آتی ہی رہتی ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ انسان صبر اختیار کرے، تو نعمتوں میں شکر کرے اور مصائب و آلام میں صبر کرے۔

دین نام ہے دو چیزوں کا

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ دین نام ہے دو چیزوں کا: (۱) شکر (۲) صبر (تفسیر عزیزی) اس لیے کہ حالت بھی دو قسم کے ہیں اور یہی حالت معنوی طور پر بھی پیش آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ یا تو آدمی طاعات میں ہوگا یا معصیت میں اور معصیت میں نہ ہونا خود طاعت کے ساتھ جڑ جائے گا، جیسے کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنا۔ تو طاعت وعبادت کا حق اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا مشاہدہ کرنا ہے کہ اس نے ہی توفیق عطا فرمائی ہے۔ (معارفِ بہلوی)

تو طاعتوں کا اقتضاء یہ فضلِ رب کا مشاہدہ ہے اور اس میں بھی ایک معنوی شکر کی شکل پیدا ہوجاتی ہے، تو اگر نیکی میں ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھے اور اگر اپنے پر نظر گئی تو عجب کا شکار ہوجائے گا اور یہ کبر کا مقدمہ ہے۔

استغفار کا فائدہ

اور چوتھی حالت نافرمانی کی ہے وہ بھی انسان سے ہوتی رہتی ہے اور اس کا علاج توبہ و استغفار ہے۔ (معارفِ بہلوی)

اور آپ ﷺ نے امت کو ہدایت کی ہے کہ کثرت سے استغفار کرے اور استغفار کا مطلب ہے گناہوں کو دھونا اور اس سے حق تعالیٰ کی محبت بھی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ امام اسفرائینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ تیس سال تک درخواست کرتے رہے کہ یا اللہ مجھ کو معصوم کردے کہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو تو ایک دن حق تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ تم معصوم بننا چاہتے ہو اور مقصد یہی ہے کہ تم میرا محبوب بننا چاہتے ہو تو میں نے محبوب بنانے کی دو کھڑکیاں کھولی ہوئی ہیں کیا تو قرآنِ کریم میں ہماری آیت تلاوت نہیں کرتا کہ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝﴾ (سورۂ بقرۃ، آیت نمبر: ۲۲۲) تو تو اس کھڑکی سے کیوں نہیں آتا اگر خطا ہوتی ہے تو توبہ کر کے مجھ کو راضی کر لے (مرقاۃ)۔ تو توبہ واستغفار سے ایک قسم کی محبوبیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

عشق اور محبت میں فرق ہے

اور محبت جو ہے وہ طرفین سے ایک چیز کو چاہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ''عشق'' کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا، محبت کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس لیے کہ عشق جو ہے یہ افراطِ محبت کا نام ہے، سب سے پہلے جو ہے آدمی کو کسی شئی کی طرف میلان ہوتا ہے، اس کے بعد رجحان ہوتا ہے اور رجحان کے بعد محبت ہوتی ہے اور محبت کے بعد عشق ہے، عشق کے بعد پھر جنون ہے اور جنون یہ مقدمۃ الفنون ہے۔ فنون فنا سے ہے، تو شروعات ہوتی ہے میلان سے، اس لیے فرمایا کہ...

غیر ممکن ہے محبت میں پریشانی نہ ہو
عشق بن جائے جنوں اور غیر عنوانی نہ ہو

تو اس میں کچھ نہ کچھ پریشانی تو ہوتی ہی ہے، اور بعض عارفین نے اس سے ایک نکتہ پیدا کیا کہ محبت کا مادّہ ''حب'' ہے اور حب کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دوحال کو پسند

نہیں کرتا، اور انسان میں دو چیزیں ہیں: ایک تو ہے بدن اور دوسرا ہے روح ، اور بدن کے شروع میں ''ب'' ہے ،اور روح کے آخر میں '' ح'' تو ادھر سے ''ب'' اور ادھر سے ''ح'' لے لو اور دونوں کو ملا لو تو '' حب'' تیار ہوجائے گا ،تو گویا بدن بھی نثار اور روح بھی نثار، یا حب جو ہے اس میں پہلی حرکت ضمہ کی ہے اور یہ حرکاتِ ثلاثہ میں ثقیل ہے دشوار ہے اور وہاں عشق کی دنیا میں شروع میں صعوبتیں پیش آتی ہیں کہ...

محبت امتحاں میں مشکلیں آسان کرتی ہے
مگر اس فتنہ گر کی ابتداء مشکل سے ہوتی ہے

جیسے تمبا کو کہ شروع میں کھائے تو چکر آتے ہیں اور بعد میں نہ ملے تو بے لطفی پیدا ہوجاتی ہے ۔ (خطباتِ حکیم الامت ج ۵ ،ص: ۳۶۷)

پڑھنے کے زمانے میں ہم نے دیکھا کہ بعض طلباء گرگٹ کو پکڑ لیتے تھے اور اس کا منھ کھول کر اسے تمبا کو کھلاتے تھے ،تا کہ اس بے چارہ کو چکر آئے تو اچھا خاصہ تماشہ ہوتا تھا اس سے ،تو تمبا کو کی شکل ہے کہ اس میں شروع میں صعوبتیں پیش آتی ہیں ، اور " حبة " دانہ کو بھی کہتے ہیں اور دانہ کو زمین میں ڈال دے تو اس سے جو ہے تنا ہوتا ہے اور برگ وبار پیدا ہوتا ہے ،تو محبت کا تخم اگر قلب کی زمین میں ہے تو اعمال کے برگ وبار اسی شکل میں ہوں گے ،تو جس شان کی محبت ہوتی ہے اس کے مناسب برگ وبار آنا شروع ہوتے ہیں اور چونکہ بندے کی طرف سے خدا اور رسول ﷺ کے حق میں محبت کی کوئی انتہا نہیں ہوسکتی ، لہٰذا قرآنِ کریم نے عشق کا لفظ استعمال نہیں کیا اور بجائے " اَحب " کے " اَشد " بیان فرمایا، جو اور لطف پیدا کررہا ہے کہ بس سارے بلغاء اس کے آگے سر دھنے تو ﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُباًّ لِّلّٰہِ ﴾ (سورۂ بقرۃ،آیت نمبر: ۱۶۵) یہ شکل ہے ۔ اور اس سے ایک چیز یہ بھی نکلی کہ اس سے اوپر کی آیت میں تفکر کا حکم دیا گیا ہے ﴿ اِنَّ فِيْ

خَلْقِ السَّمٰوٰتِ إلخ ﴾ (سورۂ بقرۃ، آیت نمبر: ۱۶۴) اور آیت اللہ میں تفکر ظاہر بات ہے کہ یہ مورثِ محبت ہے۔

اور ایک بزرگ تو عجیب بات فرماتے ہیں کہ جن میں دوستی ہوتی ہے وہ جدا ہوتے وقت کہتے ہیں کہ کوئی چیز آپ کی یادگار کے طور پر دے دیں، تو فرمایا کہ محبوبِ حقیقی کی یادگار یہ ارض وسماء اور پھیلی ہوئی کائنات ہے، مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ محبوب کو یاد کرنے کے بجائے ادھر سے اعراض ہے۔ فرمایا کہ ﴿ وَكَأَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ ﴾ (سورۂ یوسف، آیت نمبر: ۱۰۵) ''کتنی ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں کہ انسان پر گذرتی ہیں انسان دیکھتا ہے اور آنکھیں بند کر کے چلا جاتا ہے'' اس سے عبرت ونصیحت حاصل نہیں کرتا جس طریقہ سے کسی چیز کو دیکھ کر محبوب یاد آتا ہے، اسی طرح ساری کائنات حق تعالیٰ کے حق میں مذکر ہیں۔

تو بہرحال! جب حق تعالیٰ کی محبت قلب میں آجاتی ہے تو وہ گویا واٹر پروف گھڑی کے مانند ہے کہ جو قلب کی حفاظت کرتی ہے پھر دنیا کی محبتوں کا اور دنیا کی آلائشوں کا اس پر اثر نہیں پہنچتا۔

بقول حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کہ...

عاشقِ غیر میرے خانۂ دل میں کیوں بسے

یقیناً جب محبوب کا خیال اس کی نگرانی کرتا ہے تو دوسرے کا خیال کیسے آسکتا ہے۔

زندگی چار عمل سے عبارت ہے

تو اب خلاصہ یہ نکلا کہ چار حال سے خالی نہیں آدمی: یا تو وہ نعمت میں ہوگا اور اس کا اقتضاء شکر ہے، یا مصیبت میں ہوگا اس کا تقاضہ صبر ہے، اور طاعتوں میں ہے تو فضلِ رب کا مشاہدہ اور معصیت میں ہے تو استغفار۔

اور یہ چار عمل زندگی سے عبارت ہے ہر آدمی کو چاہیے کہ اسے اختیار کرے اور واقعۃً اس میں ساری زندگی کا خلاصہ آ گیا، اس لیے ان میں سے کوئی عمل فوت ہو جائے تو اس کی قضا نہیں ہے دنیائے محبت میں۔

کیسے؟ مثال کے طور پر ایک وقت تھا کہ اسے صبر اختیار کرنا چاہیے تھا، لیکن اس نے نہیں کیا تو اب جب دوسرے وقت میں وہ صبر کو انجام دینا چاہے گا تو اس وقت جو انعام تھا وہ تو فوت ہو گیا۔

روح میں جو صفات بن جائے اس میں تغیر نہیں آتا

اسی لیے لکھا ہے کہ روح میں جو صفات بن جاتے ہیں اس میں تغیر نہیں آتا، اسی لیے بڑا رونا جو ہے وہ اس کا ہے کہ ملکات حاصل نہ ہو، اسی لیے محققین کو اس کی فکر ہوتی ہے اور ملکات جو ہے ایک کیفیت ہے جو اندر بنتے بنتے بنتی ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ پھر وہی کیفیت مرتے وقت ابھر جائے گی، بلکہ خیالات میں بھی وہی چیز ہوگی، مگر چونکہ خیال پر قدرت نہیں ہے، اس لیے یہ نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے اختیار سے کلمہ پڑھ لیں گے، بلکہ فضل کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے کہ وہ توفیق سے آتا ہے۔

عبدیت بڑی چیز ہے

اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ بعض فاجر و فاسق قسم کے لوگ بڑی اچھی شکل میں دنیا سے جاتے ہیں اور بعضوں کا عنوان بڑا اچھا ہوتا ہے، مگر وہ کسی اور شکل میں دنیا سے جاتے ہیں، اس لیے اس پر فخر نہیں کیا جا سکتا ہے اللہ تعالیٰ اگر حقیقت نصیب فرما دیں تو پھر وہ بہت بڑی چیز ہے، البتہ یہ ہے کہ ہر حقیقت اپنے مناسب صورت ڈھونڈھتی ہے،

اس لیے حقیقتِ صالحہ کے لیے ہیئتِ صالحہ معاون ضرور ہوتی ہے، لہٰذا اس کی ضرورت توہے اس سے بھی انکار نہیں ہے، مگر اس پر غرور نہیں کیا جاسکتا ایک لمحہ کے لیے، دعویٰ کا حق نہیں ہے بندے کوتو عاجزی اور تواضع اختیار کرے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو چیز مارکیٹ میں نہ ملتی ہو اس کی منہ مانگی قیمت اس کے ملنے پر دی جاتی ہے، تو فرمایا کہ حق تعالیٰ کے خزانے میں ہر چیز موجود ہے، مگر مسکنت اور عاجزی نہیں ہے، اب اگر آدمی یہ لے کر پہنچے گا تو وہ بہت بڑی چیز ہے۔

(مواعظِ دردِ محبت ص: ۳۲۶)

تو عبدیت پیدا کرے اس لیے غرور نہیں کرنا چاہیے، ایک اچھا سا شعر یاد آیا کہ...

کتنے ناداں ہیں جو کرتے ہیں ترقی پہ غرور
ہم نے بڑھتے ہوئے سورج کو بھی ڈھلتے دیکھا ہے

مٹی اثر انداز نہیں ہوگی

اور بقول حکیم الاسلام رحمہ اللہ کہ سورج ایک ایسا معبود ہے کہ نکلے تو نگاہیں نہ ٹھہریں اور غروب سے پہلے چہرہ ٹھپ۔ اور علامہ شعرانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس طرح سورج غروب ہوتا ہے تو پیلا پڑ جاتا ہے، اسی طرح سے مؤمن کی زندگی جب ختم ہوتی ہے تو خدا کو کیا منہ دکھائے گا اس بات کی اسے شرمندگی ہوتی ہے اور اس کے چہرہ پر پسینہ آتا ہے، اسی لیے موت کے وقت پیشانی پر پسینہ کا آنا ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہوجانا اسے اچھی علامت سمجھا گیا ہے۔ (اشرف التوضیح، تقریرِ مشکوۃ، ص: ۲۰۶)

پھر لکھتے ہیں علامہ شعرانی رحمہ اللہ کہ یہی سورج جو غروب ہوا ہے، مگر جب وہ نکلے گا تو پھر وہی تمازت کی شکل ہے دھوم دھام سے، تو مؤمن دنیا سے جارہا ہے تو اس حال

میں ، مگر میدانِ محشر میں جب قبر سے اٹھے گا تو نور ہوگا اس کے ساتھ کہ ﴿ نُوْرُهُمْ يَسعٰى بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ ﴾ (سورۂ تحریم، آیت نمبر:۸) اور اس میں کوئی شبہ نہیں ۔

اور بقول حکیم الاسلام رحمہ اللہ کہ یہ جو پہاڑوں میں ہیرے ہیں ، جواہرات ہیں ، سونا ہے ، چاندی ہے جتنی معدنیات ہیں تمام کی روشنی میں سورج کو دخل ہے کہ ان چیزوں نے اس کو جذب کیا ہے ، تو فرمایا کہ جب مادی سورج کو جذب کرنے کے بعد اب یہ حالت ہے کہ ہزاروں سال زمین میں پڑے رہے تو اس میں تغیر نہیں ہوتا ، نکالو تو وہی چمک باقی ہے ۔ تو آپ ﷺ جو روحانی آفتاب ہیں آپ ﷺ کی محبت کی کرن جس دل اور روح میں پیوست ہوگئی ہے وہ زمین سے سینکڑوں سال بعد بھی نکلے گا تو اسی جلالتِ شان کے ساتھ کہ مٹی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی ، کیسی عجیب وغریب بات لکھی ہے واقعۃً بڑے درجہ کے شخص تھے ۔

تو یہ چار حال ہیں : اگر نعمت میں ہے تو اس کا اقتضاء شکر گذاری ہے اور زحمت ومصیبت میں ہے تو اس میں آدمی صبر سے کام لے اور اس کے ساتھ ساتھ طاعت کا حال ہے ، تو فضلِ رب کا مشاہدہ کرے اور گناہ میں ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ استغفار ومعافی اللہ سے مانگتا رہے ۔

بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے

اسی لیے بزرگوں کو زیادہ فکر ہوتی تھی اس بات کی کہ مصیبت تو ہو مگر معصیت نہ ہو ۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ قید ہوئے تو کسی نے کہا کہ حضرت ! آپ بڑی مصیبت میں ہے تو فرمایا کہ ’’ الحمد للہ ! بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے ‘‘ کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوں نہ کہ معصیت میں ۔ (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۴ ص ۲۱۰)

وہ بڑے لوگ تھے اصل یہ ہے کہ بس ان پر ایک دھن تھی اور وہ موفق من اللہ تھے، اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ...

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہوتو دیکھ
ید بیضاء لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
جنہیں میں ڈھونڈھتا تھا آسمانوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانے میں

دو چیزوں میں شرم سے کام نہیں چلتا

تو اب بس کریں، ابھی جو باتیں کہی گئی ہیں اگر کسی کو سمجھ میں نہ آئی ہوتو ساتھیوں سے پوچھ لینا چاہیے، اس میں شرم نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ دو کاموں میں شرم سے کام نہیں چلتا ایک علم حاصل کرنے میں دوسرا ناچنے میں، اس لیے فرمایا کہ " العلم عز لا یحصل إلا ذل " کہ "علم میں جیسی عزت ہے ویسی اس کے حصول میں ذلت بھی ہے"۔ اور صاحبِ کشف الظنون تو لکھتے ہیں کہ استاذ کے سامنے دو زانو بیٹھنا اور طلب ظاہر کرنا یہ تواضع ہے اور اسی پر علم کا فیضان ہوتا ہے، چنانچہ ہم نے بھی تجربہ کیا کہ استاذ سے اس ہیئت میں بیٹھ کر کوئی چیز پوچھی تو پوچھتے ہی وہ چیز حل ہوگئی۔تو عبدیت اور انکساری بڑی چیز ہے انکساری تو آپ لوگ جانتے ہیں نا، انکم ساری تو سبھی جانتے ہوں گے،تو ایک تو ہے انکم ساری کہ آمدنی اچھی ہو اور ایک ہے انکساری کہ اپنے کو جھکانا مٹانا اور یہی ہے اصل چیز۔اللہ پاک ہم لوگوں کو عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔آمین

مجلس نمبر (۵)

نفس سب سے بڑا گرو گھنٹال ہے

مجلس نمبر (۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نفس کی حقیقت

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! نفس کیا چیز ہے؟ تو آپ نے اسے سمجھانے کے لیے کہا کہ وہ ایک اسٹیم ہے جو غذا سے تیار ہوتی ہے۔ آپ کی تقریر کا حاصل یہ تھا کہ وہ گویا مادّی چیز ہے، اسی لیے نفس کھانے پینے کی چیزوں سے مطمئن ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ نے ایک مقام پر فرمایا کہ نفس اور قلب کا اطلاق ایک ہی چیز پر ہوتا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ نفس اور چیز ہے اور قلب اور چیز ہے۔ (مرقاۃ ج۱، ص: ۲۵۴)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے آخر میں یہ بحث کی ہے کہ قلبِ انسانی جو ہے اس سے احوال متعلق ہے اور دماغ اس کے لیے مدرک ہے، اور تیسری چیز یہ فرمائی کہ انسانی بدن میں طبیعت بھی ہے اور وہ مظہر ہے خواہش کا، تو ایک شکل یہ ہے کہ نفس کو آپ ایسے سمجھ لیں جیسے طبیعت، مگر یہ تعریف ایک خاص معنی کر کے ہے۔ اس کو آسان لفظوں میں آپ یوں سمجھ لیں کہ انسانی بدن میں ایک جذبہ یا ایک کیفیت یا ایک شئی قدرت نے رکھی ہے کہ وہ وقتی لذتوں کی طرف اور شر کی طرف چلتی ہے، اسی لیے قرآنِ کریم نے نفس کو سورۂ شمس میں چھ قسموں کے ساتھ ذکر فرمانے کے بعد فرمایا کہ ہم نے اس میں فجور اور تقوی کا الہام کیا ہے کہ وہ نیکی کی طرف بھی چلے اور اور بدی کی طرف بھی۔ اور عجیب بات ہے کہ فجور مقدم ہے تقوی پر، اسی لیے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نفس شر کی طرف چلتا ہے اپنی ذات میں، مگر اس کو نیکی کی طرف لانے کی کوشش کی جائے تو اس کی طرف آجائے گا اور اگر اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا

جائے تو وہ شر کی طرف چلے گا اور حضرت نے اس کی مثال دی کہ پانی میں برودت ذاتی ہے، اگر آپ اس کو آگ پر رکھ دیں تو وہ گرم ہوجائے گا خارجی اثر کی وجہ سے، مگر آپ پھر اس کو ایسے ہی چھوڑ دیں تو وہ اپنی اصل یعنی برودت کی طرف لوٹ آتا ہے، اسی لیے عین ابلنے کی حالت میں بھی وہ آگ پر گرے گا تو اس کو بجھا دے گا تو پانی میں اصل برودت ہے (خطباتِ حکیم الاسلام ج۵،ص:۱۸۲) ۔ اسی طرح نفس میں اصل شرارت ہے شر ہے۔ (فیضِ ابرار ج۱۰،ص:۲۷۴)

نفس سب سے بڑا گروگھنٹال ہے

اور نفس کی سات قسمیں ہیں:

پہلی قسم: نفسِ امارہ ہے؛ یہ بہت زیادہ شر کا حکم دیتا ہے (روح المعانی) اور قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ شیطان کے بارے میں تو فرمایا کہ ﴿ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ﴾ (سورۂ بقرۃ،آیت نمبر: ۲۶۸) کہ ''شیطان بے حیائی اور برائی کا حکم دیتا ہے'' تو شیطان کو کہا ''آمر'' حکم کرنے والا اور نفس کے بارے میں کہا کہ ﴿ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ ﴾ (سورۂ یوسف،آیت نمبر: ۵۳) تو اس کو ''اَمارہ'' کہا ہے، تو قرآنِ کریم کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس جو ہے شیطان سے زیادہ خطرناک ہے، شیطان آمر ہے اور وہ ''امارہ'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابلیس کو گمراہ کرنے کے لیے کسی اور ابلیس کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ اس کو گمراہ خود اس کے نفس نے کروایا (ملفوظاتِ حکیم الامت) معلوم ہوا کہ بڑا گروگھنٹال وہی ہے تو یہ پہلی قسم ہے نفس کی۔

دل اچھا تھا، جگر خراب ہے

نفس کی دوسری قسم ہے "لوامة" یعنی آدمی ''امارہ'' پر کچھ کوشش ومحنت کرے تو وہ

لوامۃ بن جاتا ہے، یعنی ملامت کرنے والا کہ اگر آدمی نے کوئی برا کام کیا تو وہ ملامت کرے گا کہ تم نے برا کیا تو وہ کثرت سے ملامت کرتا ہے(کشکولِ معرفت)۔جگر مرادآبادی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے کہ وہ پہلے مے نوشی کرتے تھے، یعنی شراب پیتے تھے، پھر اس سے توبہ کرلی ایک دن نفس کے زور دلانے پر پھر شراب پی لی پھر گھر پر آکر بہت روئے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ایک خلیفہ تھے مولانا عبد الباری لکھنوی رحمہ اللہ جب انہوں نے اس واقعہ کو سنا تو فرمایا کہ دل اچھا تھا، جگر خراب تھا (پرانے چراغ ج۱،ص:۳۷۲) وہ تو گویا ان کی تعبیر تھی۔

اور محققین نے اسے زمانے کا نفس بھی تسلیم کیا ہے اور اس کا زمانہ قیامت ہے اور سورۂ قیامہ میں اس کا ذکر کر کے ادھر اشارہ ہے کہ اس روز ساری کائنات کے نفوس اپنے کو ملامت کریں گے، عجیب بات ہے۔

رذائل کا ازالہ نہیں امالہ ہوتا ہے

اس کے بعد پھر نفس تیسرے نمبر پر پہنچ کر مطمئنہ ہوتا ہے، اس مطمئنہ کی کچھ صفات اور بھی ہیں اور وہ چار صفات ہیں: ایک ہے کاملہ، دوسرے ملہمہ، تیسرے راضیہ، چوتھے مرضیہ۔

تو کاملہ نفس وہ ہوتا ہے جس پر ادھر سے الہام ہوتا رہتا ہے، یعنی اب نفس نیکی پر جم گیا اور اب رذائل گویا دب گئے، کیونکہ رذائل جو ہے وہ بھی نفس سے متعلق ہیں جیسے کینہ ہے، کپٹ ہے، حبِ جاہ ہے، شہوت ہے، غصہ ہے؛ یہ سب رذائل ہیں، اور رذائل رکھیں اس لیے ہیں کہ اس سے ترقی ہوتی ہے، بشرطیکہ ان رذائل سے فائدہ اٹھائیں، مثلاً آپ موٹر کار سے موٹروے پر جاتے ہیں تو تیز چلتے ہیں، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ تیز چلنا یہ ہلاکت کا باعث ہے، مگر یہی چیز کنٹرول میں رہنے کی وجہ سے جلدی سے منزل پر پہنچنے کا باعث بھی بنتی ہے یہ ایک موٹی سے بات ہے۔ اسی طرح شہوت کا حال ہے اور

یادرکھئے کہ رذائل کا ازالہ نہیں امالہ ہوجا تا ہے(انفاسِ عیسی ص:۵۶۲) کیونکہ حدیث شریف میں آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اگرتم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اسے مان لو، مگر جب کسی شخص کے بارے میں یہ سنو کہ اس نے اپنی عادت چھوڑ دی تو اسے مت مانو، کیونکہ اس کا مکذب موجود ہے اور وہ مکذب یہ ہے کہ وہ پھر اسی حالت پر آجائے گا، جس پر پیدا کیا گیا ہے۔ ریاضت سے اخلاقِ جلیلیہ سے وہ زائل نہیں ہوتے ہاں ! مضمحل ہو جاتے ہیں۔ (انفاسِ عیسی ،ص:۱۳۹،فضائلِ ذکر،ص۳۰)

اس پر بعضوں نے اشکال کیا ہے کہ بعض لوگ شرابی ہوتے ہیں پھر نیکوں کی صحبت میں پہنچ کر خدا کی توفیق ہوتی ہے سدھر جاتے ہیں تو پھر اس کا کیا مطلب؟ تو وہاں مطلب یہ ہے کہ جو ملکہ ہے یعنی اندر کی جو استعداد ہے وہ ختم نہیں ہوتی ، بلکہ مطمئن ہوجاتی ہے ، کیسے؟ اس کو آپ ایک مثال سے سمجھ لیں ، مثلاً شہوت ہے اس کو اگر برے کام میں استعمال کروتو بربادی ہے اور اچھے کام میں استعمال کروتو تقویٰ کا حمام روشن ہوتا ہے،تو شریعت اس رذیلہ کو ختم نہیں کرے گی ، بلکہ اس کا رخ موڑ دے گی تو رذائل کا ازالہ نہیں ہوتا امالہ ہوتا ہے۔

تو نفس میں روگ موجود ہے مگر نیکی پر چلتے چلتے پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ پھر اچھے کاموں کے کرنے پر دل کو اطمینان ہوتا ہے ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کو دوسرے رخ پر نہ لے جائے ، بلکہ جب تک انتقال نہ ہو نفس سے چین نہیں۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نفس کے جذبات جو ہیں وہ قائم رہتے ہیں۔ ایک موقعہ پر وضو کرتے ہوئے فرمایا دیکھو! یہ دیوار ہے اس کو کبھی وسوسہ نہیں ہوا (خطباتِ حکیم الامت،ج۲،ص:۸۲) اور فرمایا کہ ایک اندھا اگر یہ کہے کہ میں بدنگاہی نہیں کرتا ہوں تو کونسا کمال ہوا ، اور نامرد اگر کہے کہ میں زنا نہیں کرتا ہوں تو کیا کمال ہوا ، اس لیے کہ کمال تو یہ ہے کہ اس کو استعمال کرسکتا ہو پھر اسے کنٹرول میں رکھا جائے ،تو نفس اخیر میں جا کر مطمئنہ کہلاتا ہے اور اسی پر اسے بشارت دی گئی ہے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ نفس اور شیطان میں فرق یہ ہے کہ شیطان مکار ہے اور نفس جو ہے ضدی ہے، اس وجہ سے اسے بچہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ " النفس کالطفل " (قصیدہ بردہ) اس لیے کہ بچہ بھی ضدی ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ بھولا بھی ہوتا ہے، اس لیے اسے کسی اور چیز میں لگاؤ تو کام بن جائے گا۔ (انفاسِ عیسی)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ میرا نفس جب کتاب لکھنے سے کتراتا ہے تو میں اسے کہتا ہوں تم اتنے صفحے اور لکھ لو میں تمہیں فلاں چیز کھلاؤں گا، یعنی اس کے ساتھ حکمت سے کام لیا تو جیسے بچہ ضدی ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ بھولا بھی ہوتا ہے، تو اس بھولے پن سے کام بن جاتا ہے یہی حال نفس کا بھی ہے، لیکن شیطان کا حال یہ ہے کہ وہ مکار ہے، اسی لیے کتابوں میں یہ بحث موجود ہے کہ اگر نفس میں کوئی جذبہ ابھرے تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ نفس کی وجہ سے ہے یا شیطان کی وجہ سے، تو پہلے ایک قاعدہ کلیہ سمجھ لیں! شیطان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ گناہ ہو بس، کیونکہ جب گناہ ہوگا تو حق تعالیٰ سے دوری ہوگی، اب اس کو کسی ایک گناہ سے بحث نہیں کہ یہی گناہ ہو، بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ کوئی بھی گناہ ہونا چاہیے، تاکہ اس کی وجہ سے حق تعالیٰ سے دوری ہو، ایک سے بچ گیا تو دوسرا اور دوسرے سے بچ گیا تو تیسرا، تو شیطان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح سے گناہ ہو، چاہے پھر وہ کوئی بھی گناہ ہو۔

اور نفس کا حال یہ ہے کہ مثلاً اسے خیال ہوا کہ مجھے جھوٹ بولنا ہے، مگر آپ اس وقت اس سے بچ گئے، لیکن پھر بھی وہی خیال ہوگا کہ جھوٹ بولوں پھر آپ بچ گئے، لیکن پھر وہی خیال ہوگا۔ تو نفس یہ چاہتا ہے کہ گناہ ہو اور وہی گناہ ہو جو وہ چاہتا ہے، اسی لیے بعض بزرگوں سے جو منقول ہے کہ ہمارے نفس میں ایک گناہ کا جذبہ ابھرا اور ہم نے اس کو اس سے پچیس پچیس سال تک روکے رکھا، پھر بھی وہ جذبہ ابھرا تو اس کا مطلب یہی ہے، تو معلوم ہوا کہ نفس کی عادت ضد ہے وہ ضدی ہے۔

ایک بزرگ تھے وہ کہہ رہے تھے کہ تو میرا خدا نہیں میں تیرا بندہ نہیں، تو مرید نے کہا کہ حضرت یہ کیا؟ تو انہوں نے کہا کہ میرا نفس فلاں چیز کی خواہش کر رہا تھا تو میں اسے کہہ رہا تھا کہ میں تیری بات کیوں مانوں؟ تو میرا خدا نہیں میں تیرا بندہ نہیں، تو میں تو نفس سے خطاب کر رہا تھا اللہ میاں سے تھوڑی خطاب کر رہا تھا (خطباتِ حکیم الامت ج۲،ص:۲۳۷)
تو شیطان مکار ہے اور نفس ضدی ہے، مگر بھولا بھی ہے بہت۔

اسی لیے بزرگانِ دین جو ہیں وہ نفس کو حکمت سے کنٹرول کر کے اس سے کام لیتے ہیں، اس لیے لکھا ہے کتابوں میں دیکھئے ان اکابر کی کیسی نظر تھی۔ فرمایا کہ نفس کو بہت تنگ بھی مت کرو اسے کچھ کشادگی بھی دو، ورنہ اس کا ''ری ایکشن'' ہوگا۔ اس کو سمجھانے کے لیے میں ایک واقعہ سناؤں۔ ایک آدمی تھے ان کو عبادت کا جذبہ ابھرا تو وہ مسجد پہنچے اور عبادت میں لگے رہے برابر ایک مہینہ تک اور وہاں سے نکلے ہی نہیں اور پھر جب نکلے تو گئے ہی نہیں، تو اللہ میاں کو یہ چیز پسند نہیں ہے تو وہ ایک مہینہ تک رہے، مگر ابھی پختگی آئی نہیں تھی اس لیے نفس کنٹال گیا تو نفس کو سہولت دینی چاہیے، مگر وہ سہولت اسے مباح چیزوں میں دی جائے گی مباح سمجھے نا مباح، یعنی جائز۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ سڑک پر اترے اور جی چاہتا ہے کہ کچھ بدنظری کرلیں تو نفس کو سہولت دے دی، ایسا نہیں ہوگا۔

خواہش کی مثال

اور دیکھئے! بعض مرتبہ آدمی گناہ یہ سوچ کر کرتا ہے کہ پھر توبہ کرلوں گا، حالانکہ گناہ کرنے سے وہ گناہ کا جذبہ اور قوی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خدانخواستہ کسی کو یہ خواہش ہوئی کہ میں زنا کروں اور نفس کہتا ہے کہ بس ایک مرتبہ یہ کام کرلو پھر اس سے توبہ کرلیں گے، تو وہ کام کرنے سے تسکین وقتی طور پر تو ہوگی، لیکن خواہش اور بڑھے گی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنے نوکر سے کہا کہ یہ کانٹے دار درخت اکھاڑ دو، اس

وقت وہ چھوٹا سا پودا تھا اور وہ آدمی خود جوان تھا اب نوکر نے سوچا کہ میں اسے پھر اکھاڑوں گا تو آج کل آج کل ہوتے ہوتے اب جو ہے کافی وقت گذر گیا اور بادشاہ کا توحکم تھا ہی، اب وہ نوکر دیکھتا ہے کہ میں تو جوان سے بوڑھا ہوگیا اور یہ پودا چھوٹے سے اب جوان ہوگیا ہے، مجھ میں تو اب اسے اکھاڑنے کی طاقت نہیں رہی، اس لیے کہ یہ تو اور مضبوط ہوگیا، تو ایسے ہی نفس ہے کہ اس کو جوانی میں قابو میں کرنا سہل ہے (فیضِ ابرار ج۲، ص: ۱۳۶) ورنہ نفس کو بری عادتیں لگی رہیں تو یہ تو ہوجائے گا بوڑھا اور ڈیفینس کی طاقت ہوجائے گی کمزور اور عادت ہوجائے گی مضبوط، اور پھر وہی حال ہوگا وہ گجراتی میں کہاوت ہے نا کہ ''کھوڑ جائے کھاپڑ جائے لیکن پڑی ہوئی عادت نہ جائے'' تو یہ ہے۔

تو یہ نفس جو ہے وہ ایک جذبہ ہے ایک قوت ہے اندر کی استعداد کی پھر اس میں لوگوں نے بڑی بحثیں کی ہیں کہ نفس کی دو کھڑکیاں ہیں ایک نیچے کی طرف کھلتی ہے اور ایک اوپر کی طرف اور اوپر کی جو کھڑکی ہے اس کا تعلق صدر سے ہے (فیضِ ابرار ج۱۰، ص: ۲۷۹) اور اسی شرحِ صدر کا تذکرہ قرآنِ کریم میں کیا گیا ہے، مگر اس میں بڑے لطائف ہیں وہ پھر آپ کے لیے دردِ سر کا باعث ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے دو قسم کا علاج کیا

بس اتنی بات ذہن میں رہے کہ وہ ایک مستقل چیز ہے وہ ایک قدرت ہے جو اللہ تعالیٰ نے جسم میں رکھی ہے کہ جس کا تعلق انسان کے ظاہر سے بھی ہے، کیسے؟ انسانی بدن کا جیسے روح سے تعلق ہے اسی طرح نفس کا بھی ظاہر سے تعلق ہے، مثلاً ابھی آپ نفس کا کھانا پانی بند کررہے ہیں تو وہ ڈھیلا ہورہا ہے اس کو ایسے سمجھیں کہ کوئی کنٹری ہو اس میں ایک آدمی باغی ہو اور لوگ اس کی سنتے ہو تو ظاہر ہے اس کو قید کردیا جائے گا اور اس کا کھانا پینا بند کردیا جائے گا، اسی طرح اللہ میاں نے بھی دو قسم کا علاج کیا سرکش شیاطین

جو بغاوت کرواتے تھے اس کو بند کر دیا اور بند بھی کہاں کیا جہنم میں ادھر اُدھر ہریالی میں نہیں ، اور جو نفس ہے اس کا دانہ پانی بند کیا تو بہکانے والے کا منہ ادھر بند اور اس کا منہ ادھر بند، تو یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے اب کچھ گڑ بڑ سڑ بڑ ہوتی ہے تو وہ آپ نے تعلیم میں سنا ہوگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

تو بہر حال وہ انسانی طبیعت میں ایک شئی ہے جو شر کی طرف چلتی ہے، لیکن اسے خیر کی طرف بھی موڑا جا سکتا ہے کہ ﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ﴾(سورۂ شمس، آیت نمبر: ۸) تو اگر وہ اپنی اصلی حالت پر رہے تو ''امارہ بالسوء'' ہے اور اگر وہ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے، بلکہ خیر کی طرف چلتا ہے تو ''لوامہ'' اور لوامہ کے بعد کاملہ اور پھر راضیہ پھر مرضیہ اور پھر وہی مطمئنہ کہلاتا ہے، تو شیطان بہکانے والا وہ مکار ہے کہ آدمی سے کوئی بھی گناہ ہونا چاہیے۔

نفس کا روگ خود اس کے حق میں مفید کب بنے گا

ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جنید بغدادی رحمہ اللہ سوئے لیکن نیند نہیں آئی ، وظیفہ پڑھنے بیٹھے تو اس میں جی نہیں لگا، تو بے چین ہو کر گھر سے نکلے اور رات کا وقت تھا ایک شخص کو دیکھا کہ وہ راستے کے کنارے پر کمبل اوڑھ کے پڑا ہوا ہے تو انہوں نے کہا کہ السلام علیکم تو انہوں نے کہا کہ وعلیکم السلام یا جنید، یہ حیران رہ گئے کہ تم تو اجنبی آدمی تمہیں میرا نام کس نے بتلایا؟ کہا اس نے بتلایا جس ذات نے تمہیں بے چین کر کے اس وقت گھر سے نکالا ۔ اس کے بعد حضرت جنید رحمہ اللہ نے کہا کہ کیا حال ہے تمہارا؟ تو اس نے کہا کہ مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے کہ نفس کا روگ خود اس کے حق میں دوا اور مفید کب بنے گا، تو فرمایا کہ نفس جب خود اپنی خواہشات کے خلاف چلے تو اس میں جو روگ تھا وہی اس کے لیے دوا بن جائے گا ، تو انہوں نے اپنے نفس کو کہا کہ تو نے سن

لیا جنید کو، پھر انہوں نے جنید سے کہا کہ میں اپنے نفس کو کہہ رہا تھا کہ فلاں فلاں چیز کی طرف مت جا اور خواہشات کی اتباع مت کر اسی میں کامیابی ہے، تو میرا نفس مجھے یہ کہہ رہا تھا کہ میں یہ بات جب تک جنید کی زبان سے نہیں سنوں گا وہاں تک نہیں مانوں گا، تو میں نے مقلبۃ القلوب سے یہ دعا کی کہ وہ آپ کے قلب میں یہ حرکت پیدا کرے کہ آپ گھر سے باہر نکلے تو اس کی وجہ سے پھر نہ تمہیں نیند آئی اور نہ وظیفہ میں تمہارا دل لگا اور تم بے چین ہو کر باہر آئے۔

نفس اپنی اصل کے اعتبار سے شر کی طرف چلتا ہے

تو جب کسی شئی کے تقاضے پر عمل ہوتا ہے تو اس میں قوت آتی ہے اور اس کے خلاف ہوتا ہے تو کمزوری آتی ہے جیسے بدنگاہی ہے آپ نے ایک مرتبہ کر لی تو دوسری دفعہ اور ہمت ہوگی، دوسری دفعہ کر لی تو تیسری دفعہ اور ہمت ہوگی، یہاں تک کہ پھر عادت پڑ جائے گی۔ اور اگر آپ نے کنٹرول کیا تو پہلی دفعہ بہت دشواری ہوگی اور دوسری دفعہ میں اس سے کم ہوگی تیسری میں اس سے کم ہوگی، جیسے چور ہے جب وہ پہلی دفعہ چوری کرنے جاتا ہے تو بہت ڈرتا ہے، دوسری دفعہ ذرا ہمت بڑھ جاتی ہے، تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ تو پوچھو مت کے اب اسے فخریہ بیان کرتا ہے، تو یہاں بھی یہی شکل ہے تو یہ ایک علمی گفتگو ہے، اس لیے آپ اتنا یاد رکھیں کہ وہ ایک خاص جذبہ ہے جس میں شر اور خیر دونوں ہی چیزیں ہیں اور یہ انسان کے اندر ہی ہے اور یہ اپنی اصل کے اعتبار سے شر کی طرف چلتا ہے اور خیر کی اس میں صلاحیت ہے اور خیر پر چلتے چلتے وہ نفسِ لوامہ سے راضیہ پھر ملہمہ پھر کاملہ پھر مطمئنہ ہو جاتا ہے، اور اسی پر کامیابی کی بشارت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں شیطان سے بھی پناہ مانگی گئی اور نفس سے بھی، مگر چونکہ نفس لوامہ کاملہ اور مطمئنہ بن کر مقبول بھی ہو جاتا ہے، مگر ابلیس جو ہے اس کے تو

مقبول ہونے کا سوال ہی نہیں ہے، اس لیے قرآنِ کریم پڑھنے سے پہلے تعوذ پڑھا جاتا ہے اور اس کے شر سے پناہ مانگی جاتی ہے، کیونکہ نفس میں مقبولیت کی نشانی ہے، مگر وہ جناب ہمیشہ اپنے ساتھ مردودیت لیے ہوئے ہے مقبولیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

علم پر عمل کرنے کا ایک فائدہ

اور حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے جانے ہوئے پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ اسے ایسا علم دیں گے جس کو وہ نہیں جانتا (بستان العارفین، ص:۲۵)۔

ایک تو علم حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کتاب پڑھے، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ جتنا جانا اس پر عمل کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ علمِ نامعلوم عطا فرمائیں گے۔

انسانی نفس کی مثال زرد رنگ کی ہے

اور لکھا ہے کہ انسانی نفس کی مثال زرد رنگ کی ہے اور اسی لیے بنی اسرائیل نے جو گائے ذبح کی تھی وہ زرد رنگ کی تھی، اسے ذبح کرنے کے بعد اس کے ایک عضوِ مخصوص کو مردے سے لگایا تو اس میں زندگی آ گئی اور زندگی آنے کے بعد پھر جو قاتل معلوم نہیں تھا وہ معلوم ہوا، تو قاضی بیضاوی رحمہ اللہ اس سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ جو شخص نفس پر مجاہدے کا آرا چلائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے نامعلوم چیزوں کا علم عطا فرمائے گا وہاں قاتلِ نامعلوم کا پتہ چلا تھا، یہاں علمِ نامعلوم کا پتہ چلے گا (بیضاوی شریف) اور اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان کے دلوں میں گائے کی عظمت تھی تو اس کے ذبح کا حکم دیا گیا تو یہ شکل ہوئی۔

جیسا ظرف ہوگا ویسی ہی کیفیت ہوگی

اور آپ ذرا غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ہر کام میں وہ دونوں حاضر ہیں، اُدھر سے

شیطان اور اِدھر سے نفس، اس لیے موت تک آدمی مامون نہیں ہوسکتا، اس لیے جتنا بڑا آدمی ہوگا اتنا ہی وہ اپنے کو کمتر سمجھے گا، ڈرتا رہے گا کہ بھائی ہم کیا اور ہماری حقیقت کیا اور جتنا چھوٹا ظرف ہوگا وہ اتنا ہی مطمئن ہوگا اتنے ہی دعوے ہوں گے اتنا ہی تفاخر ہوگا، اور جس پر حقیقت کھلے گی وہ سمجھے گا کہ ایک طرف شیطان ہے اور ایک طرف نفس ہے اور مجھے حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے ہیں، پتہ نہیں کیا ہوگا تو جتنا بڑا ظرف ہوگا اتنا ہی وہ ڈرے گا اور جہاں ''میں'' آگیا تو پھر بات ختم۔

انانیت سب سے بڑا روگ ہے

وہ ایک بکری تھی جو ''میں میں'' بہت کرتی تھی تو کسی نے اس کو ذبح کردیا ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت کھانے میں استعمال ہوا تو کسی نے کہا کہ...

گوشت، چمڑا، ہڈی جتنا تھا جسمِ زار میں
کچھ پک گیا، کچھ بچ گیا، کچھ بک گیا بازار میں

اس کے بعد جو اس کی آنتیں تھیں وہ سکھائی اور سکھانے کے بعد اس کا ستّو بنایا تو اس سے آواز آئی ''ہن ہن'' یعنی ''تو تو'' تو شاعر کہتا ہے کہ پہلے ''میں میں'' تھا اب جا کر ''تو تو'' ہوا ہے، وہ اگر پہلے سے ''میں میں'' چھوڑ دیتی تو یہ نوبت نہ آتی۔

انسان کی بے بسی

شاعر کہتا ہے...

کل پاؤں کاسۂ سر پر جو آگیا

یعنی پاؤں کے نیچے پرانی بوسیدہ کھوپڑی جو آگئی تو وہ ہڈی بالکل ایسی ہوگئی تھی کہ اسے ہاتھ سے ملو تو گویا راکھ بن جائے تو اس پر کسی شاعر کا پیر پڑ گیا، پیر پڑتے ہی اس

نے گویا زبانِ حال سے کہا....

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا سنبھل کے چل تو ذرا راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پر غرور تھا

وہ ہڈی یہ کہہ رہی ہے کہ کسی زمانے میں مجھ میں بھی بڑا غرور تھا، مگر موت آئی اور اس کے نتیجے میں میری کھوپڑی بالکل کھوکھلی ہوگئی اور آج میں راستے میں پڑی ہوئی ہوں، تو وہ کھوپڑی راستہ چلتے آدمی کے پیر کے نیچے آ گئی تو اس کو کہہ رہی ہے، تو جتنا بڑا آدمی ہوگا اتنا ہی بڑا اس کا ظرف ہوگا۔

رحمتِ الٰہی کے بغیر کام نہیں چلے گا

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ بغیر رحمتِ الٰہی کے کسی کا کام نہیں چلے گا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا کہ آپ کا بھی اَے اللہ کے رسول ﷺ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، مگر یہ کہ میرا رب مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیگا (مسلم شریف) تو رحمتِ الٰہی کے بغیر کام نہیں چلتا، لہٰذا کبھی بھولے سے بھی اپنے عمل پر نظر نہ ہو، بلکہ نظر اس کی طرف ہو کہ کیا ہماری نمازیں کیا ہمارے روزے اور کیا ہماری عبادتیں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ہم اپنی لائف کا سروے کریں تو ہم اپنی ہی نظرِ امتحان میں فیل ہو جائیں۔

اور امام رازی رحمہ اللہ نے تو عجیب بات لکھی کہ ہر آدمی میں عموماً کوئی ایسی کمزوری ہوتی ہے جو وہ اپنی بیوی کو بچوں کو دوستوں کو بھی بتلانا نہیں چاہتا، وہ سمجھتا ہے کہ میری کمزوری پر دوسرے لوگ واقف ہونے پر ہنسیں گے اور مجھے اپنے سے دور ہٹائیں گے،

تو وہ لکھتے ہیں کہ قربان جایئے اللہ تعالی کی رحمت پر کہ وہ انسان کی ساری کمزوریوں سے واقف ہے، لیکن بجائے نفرت کرنے کے فرمار ہے ہیں ﴿ فَفِرُّوْا إِلَى اللّٰهِ ﴾ کیسی عجیب مثال دی، ایمان تازہ ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا یہ حال ہے۔

خُلِقَ الإِنْسَانُ ضَعِيْفًا

اور انسانوں کا حال یہ ہے کہ کسی کے دو چار عیب معلوم ہوگئے تو کہتا ہے کہ اس کی بات ہی جانے دو، حالانکہ خود اس میں ہزاروں عیب ہیں۔ واقعی انسان بڑا کمزور ہے حق یہ ہے کہ جن کی آنکھیں کھل جاتی ہے ان کو رونے سے فرصت نہیں ہوتی۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ ایک مرتبہ رات میں لیٹے ہوئے تھے کسی نے کہا کہ حضرت آپ کی بزرگی کی تو لوگوں میں دھوم ہے، فرمایا چپ رہو اس نے اس لیے یہ کہا کیونکہ وہ رات میں سوئے ہوئے تھے تو وہ فرمانے لگے کہ یہ نفلی طاعت کی برکت نہیں یہ تقوی کی برکت ہے۔ (تفسیر عزیزی سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۱۶۷)

تو محرمات سے اجتناب بہت بڑی بات ہے، اس لیے منتہی کی نظر اسی پر ہوتی ہے، اس لیے اس کا اہتمام ہو اور یہ نماز روزے وغیرہ سب نفس ہی کے لیے ہیں، مگر پھر بھی ہم لوگوں کا نفس بیدار نہیں ہوتا۔ ہم نماز میں دو سجدے اس لیے کرتے ہیں کہ نفس میں شکستگی آجائے، مگر نماز پڑھنے کے بعد بھی ہم میں تواضع نہیں ہے، روزہ رکھنے کے بعد بھی ڈھیلا پن نہیں آتا، کیا کہتے ہیں ”جو ھنڈی لاکھا ماری لاکھا“ تو نفس جو ہے بس وہ اپنا کام کرتا ہے۔

اخلاص پیدا ہو جائے تو کام آسان ہے

اسی لیے لکھا ہے نفس کی معرفت ہی مشکل ہے۔ ہاں! یہ ہے کہ آدمی صحبت اختیار

کرے صالحین کی اور شرعی احکام پے لگا رہے تو دھیرے دھیرے وہ حقیقت آجائے گی، اور ذرا بھی اخلاص آگیا بس پھر تو کام بن گیا، ورنہ نفس یہاں بھی لگا رہتا ہے، مثلاً مجھے صدقہ دینا ہے تو نفس یہ چاہے گا کہ پہلے شہرت ہو۔

ہندوستان میں کوئی سیٹھ صاحب باہر کے ملکوں سے آتے ہیں تو کوئی مدرسہ والا ان سے پیسے مانگتا ہے تو کوئی زیادہ توجہ نہیں دیتے اور اگر یوں کہا جائے کے تم پیسے دو تو ہم تمہارا نام کمرے کے اوپر لکھدیں گے، تو وہ فوراً کہے گا کہ کتنے چاہیے۔ اب مسئلہ گیا سارا اور یہ صرف سیٹھ صاحب کا مسئلہ نہیں ہے ہر لائن میں ایسا ہے، ہر آدمی مولوی ہو کہ مفتی ہو کہ مفسر ہو کہ کوئی ہو، ہر ایک کے ساتھ نفس ہے کسی ایک کی بات نہیں ہے، ہر ایک کے ساتھ نفس ہے۔ بس اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل سے بچائے۔

کسی کو حقیر نہ سمجھے

ورنہ یہ دونوں ایسے دشمن ہیں کہ اول تو کچھ کرنے نہیں دیتے کر لیا تو وہ چاہتے ہیں کہ اسے محفوظ نہ رہنے دیں، جیسے تہجد ہے پہلے تو وہ پڑھنے نہیں دیں گے اور اگر پڑھ لیا تو اوروں کی حقارت اس کی نگاہ میں لاتے ہیں۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ کا واقعہ ہے وہ کہتے ہیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ میں نے تہجد پڑھی تہجد کے بعد میں نے مسجد میں دیکھا کہ کچھ لوگ سوئے پڑے ہیں تو میں نے والد صاحب سے کہا کہ فلاں لوگ غافل ہیں کہ سوئے پڑے ہیں تو ان کے والد نے کہا کہ تم نے تہجد پڑھ کر ان کو حقیر جانا ان کی حقارت تمہارے دل میں آئی، اس سے بہتر یہ ہوتا کہ تم تہجد نہ پڑھتے، تا کہ ان کو حقیر نہ جانتے (بہارِ گلستاں شرح گلستاں، ص: ۱۵۴) تو ٹوٹا دل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس لیے لکھا ہے کہ کتنے گنہگار صرف اپنے کو گنہگار سمجھنے کی وجہ سے جنت میں چلے جائیں گے کہ یا اللہ! میں بہت گنہگار ہوں یہ بہت بڑی چیز ہے۔

دل ٹوٹ کر باقیمت بنتا ہے

دنیا میں شیشے کے برتن ٹوٹ کر بے قیمت ہوجاتے ہیں کہ اپنی قیمت کھو بیٹھتے ہیں اور دل ٹوٹ کر باقیمت ہوتا ہے، اس لیے خدا کو ٹوٹا ہوا دل بہت پسند ہے کہ ہم کچھ نہیں، مگر رونا یہی ہے کہ یہ حقیقت ہمارے اندر نہیں آتی جہاں آدمی نے عمرہ کیا حج کیا نفلیں پڑھیں تلاوت کی صدقہ کیا کہ بس وہ یہی سمجھنے لگتا ہے کہ جو کچھ کیا میں نے ہی کیا، اس لیے کتابوں میں لکھا ہے کہ جہاں بندہ کچھ کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میں نے کیا تو غیب سے ندا آتی ہے کہ اَے بندے! تو نے کیا کیا؟ خیال ہم نے پیدا کروایا، ارادہ ہم نے پیدا کیا، توفیق ہم نے دی، اَے بندے! تو نے کیا کیا، اور جب بندہ کچھ کر کے یہ کہتا ہے کہ مجھ سے کچھ نہیں ہوا تو غیب سے آواز آتی ہے کہ نہیں نہیں اَے بندے! تو نے کوشش کی عمل کیا وغیرہ۔ (خطباتِ حکیم الاسلام ج۳، ص: ۳۳۵)

انسانی مزاج بھی عجیب ہے

اور انسانی مزاج بھی عجیب ہے آپ دیکھئے! آپ کے سامنے ایک آدمی ہے وہ یہ کہے آپ سے کہ میں کچھ نہیں جانتا تو آپ کہتے ہیں کہ نہیں نہیں اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت نوازا ہے۔ اور آپ سے کوئی یہ کہے کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں تو آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں اور جہاں آپ سے کوئی یہ کہے کہ آپ جاہل ہیں تو آپ اسے کہیں گے کہ تو جاہل تیرا باپ جاہل یہ انسانی مزاج ہے، تو اپنے کو کچھ نہ سمجھے آدمی یہ بہت بڑی چیز ہے۔

اس کی مشق کرو کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

میں طلباء سے کہتا ہوں مدرسہ میں کہ یہ کہنے والے تو بہت ہیں کہ ہم بہت بڑے

عالم ہیں، مگر یہ کہنے والا کوئی نہیں ہیں کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں تو اس کی مشق کرو کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں اور جب یہ حقیقت پیدا ہو جائے گی تو لوگ آپ کی بزرگی کے نعرے لگا رہیں ہوں گے اور تم شرمندہ ہوں گے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ پھر لوگ تعریفی کلمات کہیں گے تو آپ کو ایسا لگے گا جیسے کسی نے تھپڑ مار دیا ہو۔ دیکھو! میں اس کی مثال دوں آپ کو ایک آدمی شرابی ہو جواری ہو اب اس کے پاس کوئی پہنچ جائے اور یہ کہے کہ اس پانی دم کر دیجئے، تو اس کی کیا حالت ہوگی وہ آپ اندازہ لگائیے۔ یہی کیفیت ہمارے اندر بھی شرمندگی کی ہونی چاہیے اگر چہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں ہم روزے رکھ رہے ہیں، مگر اگر کوئی پانی پر دم کرنے کو کہے تو ہم یہ سمجھیں کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں، یہ کیفیت پیدا ہونی چاہیے، جیسے آپ ایک چلتے آدمی کو پکڑ لے جو بالکل آؤٹ لائن کا ہو اور آپ اس سے یہ کہیں کہ آپ ذرا میرے لیے دعا کر دو اور یہ پانی پر دم کر دو تو وہ اگر کھلے دل کا ہوگا تو صاف کہہ دے گا کہ تم کہاں بھولے پڑے، سمجھ میں آیا کہ نہیں۔ بس! یہی حال ہم لوگوں کا بھی ہونا چاہیے اور جس کا جتنا بڑا ظرف ہوگا وہ اتنا ہی اپنے کو کمتر سمجھے گا، چاہے پورا عالم اس کے نام کے نعرے لگاتا ہوگا، مگر وہ اپنے کو کچھ بھی نہیں سمجھے گا تو اپنے کو مٹانا بہت بڑی چیز ہے۔

دیکھئے! آدم علیہ السلام نے اپنے کو مٹایا کہ ان سے ایک کام ہوگیا تو اس کی وجہ سے دو سو سال تک آسمان کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی اور ابلیس کے بارے میں بعض تفسیروں میں ہے اس کو دنیا میں پھینکا تو وہ اکڑ کر کھڑا ہوا۔ اور آدم علیہ السلام کے متعلق تفسیروں میں ہے گھٹنے پر سر تھا ان کا شرمندگی کی کیفیت تھی (تفسیر عزیزی، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۳۵۵)

لوگ تو بڑے مزے سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم سے گناہ ہوا تو کیا بڑی بات ہے باوا آدم سے بھی گناہ ہوا تھا، مگر ان کو آدم علیہ السلام کی یہ کیفیت نظر نہیں آتی اور وہاں بھی ان کا

مقصد گناہ نہیں تھا، بلکہ ﴿ هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴾ (سورۂ طٰہٰ، آیت نمبر: ۱۲۰) اور بھی خدا جانے کتنی حکمتیں ہوں گی تو وہ بعض نادان لوگ کہہ دیتے ہیں...

آدم سے ہوئی نادانی
جنت کا چھوٹا دانا پانی

تو نادانی کا لفظ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں بڑی گستاخی ہے، اس کی تعبیر یوں کرنی چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے ایک بات ہوئی یہ نہیں کہ گناہ کیا۔

قرآنِ کریم نے بھی ایک مقام پر کہا ہے کہ ﴿ فَنَسِيَ اٰدَمَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْماً ﴾ (سورۂ طہٰ،آیت نمبر:۱۲۱) ویسے " وعصی آدم "بھی فرمایا ہے۔

شاہ عبدالغنی پھول پوری رحمہ اللہ نے اس کی بڑی اچھی تطبیق دی کہ نسیان یہ حضرت آدم علیہ السلام کے بلند مقام کے اعتبار سے فرمایا، ورنہ فی حد ذاتہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم توڑنا نہیں تھا وہ نسیان تھا اور بڑے لوگوں کا معاملہ ایسا ہے جیسے یہ ٹیوب لائٹ، اس کے پاس ایک پتنگا بھی پڑا ہوگا تو نظر آئے گا اور اندھیرے میں پڑا ہوا پتھر بھی نہیں دکھے گا تو بڑوں کی چھوٹی بات بھی بڑی ہو جاتی ہے،تو سب سے بڑی چیز ہے اپنے کو کچھ نہ سمجھنا،جس نے اپنے آپ کو تواضع سے متصف کیا تو پھر وہ گھر میں بھی محبوب ہے، محلے میں بھی محبوب ہے،شہر میں بھی محبوب ہے۔اور تکبر تو انسان کو بھی پسند نہیں اللہ میاں تو بڑی بات ہے۔

اسی لیے دیکھئے ایک آدمی ذرا بن ٹھن کے نکلتا ہےتو لوگ کہتے ہیں کہ" ہلکو چھے"۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب ایسے لوگوں کو جہنم کا عذاب ہو رہا ہوگا تو وہ تمنا کریں گے کہ کاش ہم سور کتے اور بلی ہوتے یا پاخانہ کی نجاست کے کیڑے ہوتے کہ یہ ذلت پیش نہ آتی۔آدمی کیا فخر کرے بڑائی تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، ہم تو کچھ نہیں ہیں چاہے کوئی ہمارے نام کے کتنے ہی نعرے لگائے۔

میرے چونکہ سفر بہت ہوتے رہتے ہیں تو لوگ ذرا تعریفی کلمات کہتے ہیں تو میں ان کو کہتا ہوں کہ دیکھو آپ ﷺ نے ساتوں آسمانوں کا سفر کیا، مگر جب اس کا قرآنِ کریم نے تذکرہ کیا تو کیا کہا ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا ﴾إلخ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت نمبر: ۱) تو معلوم ہوا کہ سفر کے بعد آدمی میں عبدیت آنی چاہیے تو عبدیت بہت بڑی چیز ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے یہاں کا اور وہاں کا سفر کیا یہ کچھ بھی نہیں، اصل تو وہاں کی مقبولیت ہے، ورنہ ابلیس ساری دنیا کا سفر کرتا ہے۔

بہر حال! پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ آدمی عبدیت پیدا کرنے کی کوشش کرے اور گناہ ہوجائے تو توبہ کرے اور اپنے کو کچھ نہ سمجھے اور مایوس نہ ہو، لگا رہے اللہ تعالیٰ کو توبہ بہت پسند ہے، اگر پوری زندگی ایک بھی گناہ سے نہ بچ پایا، مگر کوشش کرتا رہا کہ اَے اللہ! میں بڑا گنہگار ہوں تو ان شاء اللہ بیڑا پار ہے، تو طلب بہت بڑی چیز ہے، اس لیے فخر وغرور، دعوے سب کم ظرفی کی چیز ہے، اصل چیز اپنے کو مٹانا ہے، پورا عالم بھی ہمارے نام کا نعرہ لگائے، تب بھی ہم یہ سمجھیں کہ ہم کچھ نہیں ہیں۔

گنے کے تنے کے مٹھاس کی وجہ

مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پتھر جو ہے سخت ہے اور زمین نرم ہے اپنے کو مٹائے ہوئے ہے، تو آسمان سے جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر پھول کھلتے ہیں پتھر پر نہیں کھلتے، تو اپنے اندر کا حال اچھا ہے تو اس کو چھپاؤ۔

اور مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عام درختوں کا حال یہ ہے کہ ان کی مٹھاس اور حلاوت پھلوں میں تقسیم ہوجاتی ہے، تو ان کا تنہ جو ہے وہ پھیکا ہوتا ہے، مگر گنّہ اپنی حلاوت کو چھپاتا ہے تو وہ تنے سے لے کر اوپر تک میٹھا ہوتا ہے، تو اس سے سبق یہی دینا

ہے کہ آدمی بھی اپنی نیکی کو چھپائے ، مگر یہ بھی عجیب ہے کہ نیکی چھپتی نہیں، ایک واقعہ سنا کر بات ختم کروں ۔

نیکی چھپتی نہیں

فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ ایک بزرگ گذرے ہیں ان کے حالات میں لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے والد صاحب ہمیں پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات سناتے تھے اس میں ایک نبی کا واقعہ سنایا کہ انہوں نے خواب دیکھا کہ کوئی ان سے یوں کہہ رہا ہے کہ جب صبح ہو تو جو چیز سب سے پہلے تمہارے سامنے آئے اسے کھا لینا، اور دوسری چیز کو چھپا دینا ، اور تیسری چیز کو قبول کر لینا اور چوتھی کو نا امید نہ کرنا اور پانچویں سے بھاگنا۔ جب صبح ہوئی تو اول جو چیز سامنے آئی وہ ایک بہت بڑا پہاڑ تھا یہ حیران کہ اسے کس طرح کھاؤں ، مگر رب کا حکم تھا کھانے کے ارادہ سے چلے اور قریب پہنچے تو وہ چھوٹا بن گیا اور شہد سے زیادہ شریں ایک نوالہ پایا اس کو کھا لیا اور اللہ کا شکر کر کے آگے چل دئے ۔

دوسرے درجہ میں سونے کا ایک طشت سامنے آیا جسے چھپانے کا حکم تھا تو زمین میں ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا اور روانہ ہو گئے ، مگر اُدھر منھ کر کے دیکھا تو وہ طشت باہر نظر آیا پھر دفن کیا مگر وہی حال، آخر چند مرتبہ دفن کر کے یہ سوچا کہ میں رب کے حکم کی تعمیل کر چکا ہوں اور اس کو اسی حال میں چھوڑ دیا۔ پھر سامنے ایک پرندہ نظر آیا اور اس کے سامنے باز شکاری تھا کہ اس کو کھا جائے ، پرندہ نے کہا اَے اللہ کے نبی ! میری مدد کرو پس آپ نے اس کی درخواست کو قبول کیا اور اس کو اپنی آستین میں چھپا دیا اتنے میں باز آیا اور کہنے لگا اَے اللہ کے نبی ! میں بھوکا تھا اور صبح سے اس کی طلب میں تھا اب اس کے قریب تھا کہ آپ نے اس کو چھپا دیا پس مجھے میرے رزق سے نا امید نہ کیجئے ، تب انہوں نے کہا

مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ تیسری چیز کو قبول کروں اور چوتھی کو ناامید نہ کروں اور چوتھا یہ باز ہے پس کیا کروں؟ آخر حیران ہو کر اپنی ران میں سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر باز کی طرف پھینک دیا اور باز اس کو لے کر چلا گیا اور پرندے کو چھوڑ دیا۔ پانچویں چیز ایک بدبودار لوتھڑے پر نظر پڑی تو یہ اس سے بھاگے جب رات ہوئی تو انہوں نے عرض کیا اَے رب! آپ نے مجھے جو حکم دیا تھا وہ میں نے کرلیا، اب ان چیزوں کی اصلیت تو مجھے بیان فرما دیجئے۔ پس خواب میں دیکھا کوئی کہتا ہے پہلی چیز تم نے کھائی وہ غصہ تھا کہ شروع میں مثل پہاڑ کے ہوتا ہے اور آخر میں صبر کیا جائے تو شہد سے زیادہ شریں ہوتا ہے، دوسری چیز نیک عمل ہے اگر انسان اس کو چھپاتا ہے تو وہ خود ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ تیسری چیز کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی تمہیں کسی امانت کا امین قرار دے تو اس میں خیانت نہ کرو۔ چوتھی کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی تم سے کسی حاجت کا سوال کرے تو اس کو پورا کرنے کی کوشش کرو اگرچہ تم اس کے حاجت مند ہوں۔ پانچویں چیز غیبت ہے پس جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں ان سے بھاگو۔ (البصائر فی تذکیرۃ العشائر)

تو بہرحال! مجھے تو اس سے بتانا یہ ہے کہ نیک عمل کرکے اس کو چھپاؤ اگرچہ اللہ تعالیٰ جیسا کہ اس واقعہ میں بھی آیا اس کو ظاہر فرما دیتے ہیں۔

اپنے اندر عبدیت پیدا کریں

تو بہرحال! آدمی یہ سوچے کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں، بتایئے! کیا ہماری نمازیں کامل ہیں؟ ہر ایک کو پتہ ہے نماز میں اس کا دھیان کہاں ہوتا ہے، بس اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سمجھ دے دے کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ چیز بہت پسند ہے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جس مارکیٹ میں کوئی چیز نہ ملتی ہو اس کو لے کر جاؤ تو اس کی بڑی قدر ہوتی ہے اور اس کی منھ مانگی قیمت ملتی ہے تو

اللہ تعالیٰ کے خزانے میں ہر چیز ہے، تکبر ہے، بڑائی ہے، شوکت ہے، عزت وجلال ہے ، وہاں نہیں ہے تو عاجزی اور عبدیت نہیں ہے۔ آدمی وہ لے کر پہنچے گا تو کام بن جائے گا (مواعظِ دردِ محبت) اور اگر یہ آ گیا کہ میں ایسا اور ویسا ہوں تو اس کا انجام بہت برا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اس کی حقیقت نصیب فرمائے اور نفس وشیطان کے ہتھکنڈوں سے بچائے اور یہ توفیق دیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہم سے زیادہ برا کوئی نہیں ہے تو اس کی کوشش کرتے رہیں اور مایوس نہ ہو تو ان شاء اللہ کام بن جائے گا۔

مجلس نمبر (٦)

بنیادِ خلافت عبدیت ہے

مجلس نمبر (٦)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال: ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کوئی مخلوق موجود تھی زمین پر؟

ملائکہ کی حضرتِ انسان پر اعتراض کی وجہ

جواب: جنات تھے اور انہیں پر قیاس کیا تھا ملائکہ نے انسان کو اور کہا تھا کہ ﴿ أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ﴾ (سورۂ بقرۃ، آیت نمبر ۳۰) (تاریخ جنات وشیاطین ص: ۵۳)

تو جنات پر انسان کو قیاس کیا جیسے ایک مولوی سے کوئی غلطی ہو جائے تو لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ''بدھاج مولوی ایوا'' (سبھی مولوی ایسے) تو یہاں انہوں نے ایسا ہی قیاس کیا، اس لیے امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیرِ کبیر میں یہ بحث کی ہے کہ ایک فرقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ملائکہ محفوظ نہیں اور دلیل میں یہی بات پیش کی ہے آدم علیہ السلام پر اعتراض کرنا، کیونکہ وہ صفت جو انہوں نے ذکر کی تھی وہ ان میں اس وقت پائی نہیں گئی تھی اور جو صفت کسی میں نہ ہو اس سے کسی کو متصف کرنا یہ بہتان کی اور جرح کی شکل ہے۔

مثلاً عبد اللہ بن وہب رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ پر جرح کی تو محدثین میں شور ہوا۔ یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ امام شافعی رحمہ اللہ پر جرح کی تو شور مچ گیا۔ امام دارِ قطنی رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر جرح کی تو شور مچ گیا (امداد الباری شرح بخاری) اور قاعدہ ہے کہ جو کسی پر جرح کرے تو خود اس پر جرح ہوتی ہے، پھر یہ کہ فرشتوں نے اپنی عبادت کا ذکر کیا اور یہ عبادت کا ذکر ایک قسم کا اعجاز ہے اور معبِد میں عجب کیا، اور پھر عجب جو ہے وہ تکبر کا ایک شعبہ ہے، مگر حق یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی دلیل میں

جان نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر اعجاز بھی نہیں ہے اور کبر بھی نہیں ہے، وہاں تو اطاعت گذاری کی شکل ہے اور ان کے کہنے کا منشاء بھی یہی تھا کہ ہم جیسے اطاعت شعار موجود ہے مناسب تھا کہ ہم اس کام کو انجام دیتے۔

خلافت کے لیے جامعیت ضروری تھی

تو فرشتوں نے چاہا صحیح کہ وہ اس کام کو انجام دیتے، مگر الفاظ ہے "في الأرض" اور وہ خود ہی بتا رہا ہے کہ وہ مقام ہے خون وفساد کا، تو جب وہ مقام ہی خون وفساد کا ہے تو وہاں جو مخلوق ہے وہ متمنی ہے خلافت کی اور خلافت اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جبکہ اس میں جامعیت ہو، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جو آئینہ قرار دینا چاہتے ہیں وہ جامع ہے۔

اس کی مثال آپ ایسے سمجھئے کہ آدمی جب آئینہ خرید نے جاتا ہے تو ایسا آئینہ نہیں خریدتا جو بالکل کالا ہو کہ اس میں کچھ نظر ہی نہ آئے، اور ایسا بھی نہیں خریدتا کہ جو دونوں طرف صاف وصفاف ہو کہ نظر اس میں جا کر دوسری طرف پار ہو جائے اور واپس نہ آئے، تو ایک پہلو تو آئینہ کا ایسا ہونا چاہیے کہ جو صاف وصفاف ہو اور دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ گیرو یا کوئی لکڑی لگی ہو، تا کہ کثافت ہو، تو فرشتوں کا آئینہ وہ ہے کہ جس میں دونوں طرف صفافیت ہے کہ شہوت وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے، اور شیاطین اجنہ وہ ہیں کہ ان میں شر غالب ہے تو دونوں طرف کثافت ہے، اور آدم اور ابنِ آدم کا آئینہ وہ ہے کہ اس میں ایک پہلو ملکیت کا ہے اور دوسرا پہلو بہیمیت کا ہے، تو ایک پہلو صاف وصفاف اور دوسرا پہلو کثافت والا، اسی لیے اگر آئینہ ایسا ہو کہ ایک طرف صفافیت ہو اور دوسری طرف گیرو یا کوئی لکڑی لگی ہو تو آپ کے چہرے کا عکس چکر کھا کر واپس آتا ہے، تو خلافت کے لیے ایسے ہی آئینہ کی ضرورت تھی، تا کہ کمالاتِ ربانی کا عکس جب اس آئینہ میں پڑے، یعنی

انسانی آئینہ میں تو دوسروں تک وہ متعدی ہوسکے، تو افادی حیثیت کے لیے جامعیت کی ضرورت تھی جو انسان میں موجود تھی۔ (فیضِ ابرار ج۹، ص: ۲۶۹)

دوسری بات یہ کہ فرشتوں میں شہوت نہیں تھی اور شہوت خود ترقی کا باعث ہے، اور بقول حکیم الاسلام رحمہ اللہ کہ ترقی کا تعلق ٹکراؤ سے ہے، تو ملکیت اور بہیمیت کے ٹکراؤ سے شقاق کی اور عرض کی شکل پیدا ہوگی تو کمالات اس سے کھلنا شروع ہوں گے۔ اور اگر آدمی میں شہوت نہ ہوتو پھر کمال ہی کیا ہے جیسے اگر کوئی اندھا بدنظری نہ کرے تو اس میں کمال ہی کیا ہے، کمال تو یہ ہے کہ اختیار ہو اور پھر اس سے رُکے، تو اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ آدمی اختیار سے کوئی کام کرے اور اختیار سے کسی کام سے رُکے۔

سوال: یہاں ایک آدمی نے عرض کیا کہ حضرت نوری اور ناری کے مسئلہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔

فرمایا ہمارے حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی ایک بات بڑی عجیب ہے، فرماتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر بشر نہیں ہیں، تو حضرت فرماتے ہیں کہ نبوت و رسالت یہ اتنا بڑا شرف ہے کہ اگر اس میں کوئی پہلو بشریت کا نہ ہوتا تو بھی اس میں سے نکال کر اس کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور یہ عجیب حماقت کی بات ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر بشر نہیں ہیں، گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری نوع سب سے بڑے اس شرف سے محروم ہے، حالانکہ پیغمبر خود یہ کہہ رہے ہیں کہ ﴿ إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ ﴾ (مسند ابو یعلی) اور یہ کہتے ہیں بشر نہیں ہیں، ہم کہتے ہیں کہ بشر ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں کہ بشر ہے، لیکن عام بشر کی طرح نہیں جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ صومِ وصال مت رکھو، اس پر صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں تو آپ نے ممانعت فرمائی اور خود آپ رکھتے ہیں تو فرمایا کہ " أيكم مثلي يطعمني ربي ويسقيني " (متفق علیہ) " تم میں مجھ جیسا کون ہے

مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے'' تو" بشر مثلکم " بھی ہیں اور " أیکم مثلی " بھی ہیں، جیسے ہم سب صرف آگے کی طرف دیکھتے ہیں پیچھے کی طرف نہیں دیکھ سکتے ، اور آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں پیچھے کی طرف بھی دیکھتا ہوں (بخاری) تو یہ بھی فرمایا کہ میں تمہاری طرح انسان ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ تم میں کون ہے میری مانند؟۔

(خطباتِ حکیم الاسلام ج ۵، ص: ۱۷۶، ۱۷۷)

تو پتہ چلا کہ نبوت کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں ، ویسے ضروریاتِ طبعیہ کے لیے آپ ﷺ پیشاب پاخانہ کے لیے بھی تشریف لے گئے ، شادی آپ نے کی، سفر آپ نے کئے ، دوست ودشمن آپ کے ہوئے ، بیماری آپ کو ہوئی ،تکلیفیں آپ کو پہنچیں ،لہٰذا بشریت ثابت ،تو پیغمبروں کو بھی انسانی ضروریات پیش آتی ہیں ، اور دوسرا جو پہلو ہے وہ عام بشروں سے بہت ممتاز ہے کہ وحی آپ پر آرہی ہے،معراج آپ فرمارہے ہیں ،معجزے آپ کو دئے گئے ،معصومیت آپ کو دی گئی اور فلاں فلاں فلاں ، اور سب کچھ دیکھنا ہوتو خصائصِ کبریٰ اٹھا کر دیکھیں آدمی ،تو آپ بشر ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔مفتی احمد یار خان گجراتی نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ'' محمد بشر لا کالبشر ،یاقوت حجر لا کالحجر''۔

(جاءالحق ،ص: ۱۶۲)

تو دونوں پہلو ہیں، اور یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کو عام انسانوں سے کیا نسبت آپ ﷺ کا ایک سجدہ ساری انسانیت پر بھاری ہے،کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ، اور ایک مرتبہ آپ ﷺ کی جو فجر کی نماز قضا ہوگئی (مشکوۃ) وہ اس لیے کہ امت کے سامنے قضا نماز کے احکام آجائیں(فضل الباری ج ۲، ص: ۵۲۰) اس لیے وہ چیز گذاری گئی اور پیغمبر کچھ کام ایسے اس لیے کرتے ہیں جو ان کی سطحِ عالی سے نیچے کے ہوتے ہیں، تا کہ امت اس کی اقتداء کرسکے۔

زیادہ کھانا کمال کی بات نہیں ہے

ورنہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں نے اتنا ذکر کیا ہے کہ مجھے کھانے کی حاجت نہیں اتباعِ سنت میں کھاتا ہوں۔ (خطباتِ حکیم الاسلام ج۱،ص:۸۹)

پنڈت دیانند سرسوتی تھا وہ بہت کھاتا تھا خونچے کے خونچے صاف کرجاتا تھا۔ حضرت کے متعلقین نے مزاحاً اس کے لوگوں سے کہا کہ علم میں مناظرہ ہوتو ہمارے حضرت جیتیں گے اور کھانے میں مناظرہ ہوا تو دیانند جیتے گا۔ (حکایاتِ اولیاء، ص:۱۷۲)

حضرت نے بعد میں اس پر فرمایا کہ کھانا تو بہیمیت ہے جانور پن ہے (خطباتِ حکیم الاسلام ج۱، ص: ۸۹) اور بہیمیت جہالت ہے، اسی لیے آدمی چھپا کر کھانے بیٹھتا ہے اور کھاتے وقت کہتا ہے کہ دروازہ لگالو، اور مناظرہ علم میں ہوتا ہے تو حضرت فرماتے تھے کہ زیادہ کھانا کمال نہیں ہے اگر پنڈت زیادہ کھاتا ہے تو ہم اس کے مقابلہ میں بیل کو لاکر کھڑا کردیں گے کہ کرو اس سے مناظرہ (حوالہ بالا) پھر فرمایا کہ ہاں نہ کھانا کمال ہے اور یہ فرمایا کہ پنڈت دیانند اور مجھے ایک کمرے میں بند کرو اور چھ مہینے تک کھانا مت دو پھر دیکھو کون تروتازہ نکلتا ہے، چھ مہینے تو کیا چھ دن میں اس کی لاش پڑ جاتی۔ جب امتیوں کا یہ حال ہے فرمایا کہ اتنا ذکر کیا ہے کہ اب کھانے کی حاجت نہیں رہی، اتباعِ سنت میں کھاتا ہوں، تو پھر حضور ﷺ کے ذکر کا کیا حال ہوگا آپ کا کیا پوچھنا، مگر آپ ﷺ نے کھایا ہے، آپ ﷺ کو بھوک بھی لگی ہے، فاقہ بھی کیا ہے، سارے احکام آپ پر سے گذاریں، یہ نزول کا مقام ہے، تاکہ لوگ اتباع کرسکے، ورنہ آپ ﷺ تو سجدہ میں رہتے ہمیشہ یہ کافی تھا آپ کے لیے، آپ کی روحانیت تک کوئی پہنچ سکتا ہے؟ تو نبوت ورسالت ایسا شرف تھا کہ کوئی جہت اگر نہ نکلتی انسانوں میں ہونے کی تو کوشش کرکے ان کو بشر ثابت کیا جاتا بقول حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے، اور یہاں یار لوگ کہتے ہیں کہ بشر نہیں ہے۔

انسان بڑا مفسد ہے

تو میں عرض کر رہا تھا کہ مقایسہ ہوا اور اس میں بھی فساد کا لفظ ذکر کیا اور واقعی انسان بڑا مفسد بھی ہے۔

فساد کی تعریف یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام جو نظام قائم کرتے ہیں صلح کا اس کے خلاف چلنا اور ہر شئی کا فساد اس کے لائق ہوتا ہے جو چیز جس کام کے لیے ہو وہ اس سے نہیں ہو رہا ہے تو یہ فساد ہے، اور پھر کہا: ﴿ وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾ (سورۂ بقرۃ،آیت نمبر ۳۰) دم نہیں لائے دماء لائے اور واقعی خون ریز ہے انسان کہ جانوروں کا خون یہ کرتا ہے، درندوں کا خون یہ کرتا ہے، پرندوں کا خون یہ کرتا ہے، چرندوں کا خون یہ کرتا ہے اور انسانوں کا خون کرتا ہے، سمندر کی مچھلیاں گرل ڈال کر ان کے جذبات کا خون یہ کرتا ہے۔ یہ جملہ کہ ''ان کے جذبات کا خون'' میں نے اس لیے بڑھایا کہ یہ بحث نہ آئے کے مچھلی میں خون ہوتا ہے یا نہیں؟ چونکہ یہاں اربابِ علم ہیں لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

خلافت کی بنیاد علم ومعرفت ہے

لیکن یہ کہ خلافت کی بنیاد علم ومعرفت ہے (ملفوظاتِ محدث کشمیری، ص: ۱۷۵) اسی لیے آدم علیہ السلام کی خلافت کو ثابت کرنے کے لیے جوہرِ علم کھلوایا گیا جوہرِ عبادت نہیں۔ معلوم ہوا کہ تاجِ خلافت جوہرِ علم کے ساتھ ہے اس سے سلوک کا ایک مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ ولایت کی بنیاد علم ومعرفت ہے بشرطیکہ فسق و فجور نہ ہو۔

حضرت شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلافت کی بنیاد عبدیت ہے۔

(ملفوظاتِ محدث کشمیری، ص: ۱۷۵)

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلافت کی بنیاد علم ومعرفت ہے۔ اور

بندہ کا ناقص خیال یہ ہے کہ دونوں میں تضاد نہیں ہے، اس لیے کہ جتنی معرفت ہوگی اتنی ہی عبدیت ہوگی۔ حضور ﷺ جیسے " أعرف الناس " تھے ویسے ہی " أعبد الناس "بھی تھے، اسی لیے دونوں کو جوڑا ہے کہ ' ما عرفناك حق معرفتك " اور " ما عبدناك حق عبادتك "۔اور " ماعرفناك حق معرفتك " سے خودحق کی معرفت کا پتہ چلتا ہے، پیغمبر کا یہ جملہ کہ '' اے اللہ! جیسا آپ کو پہچاننا چاہیے ہم نے نہیں پہچانا '' یہ جملہ خود اعلان کررہا ہے کہ حضور ﷺ پر ادھر کے پہلو کھلے ہیں اور اتنے کھلے ہیں کہ آپ فرما رہے ہیں کہ ہم حق کی معرفت نہیں کرسکتے۔ تو بظاہر جملہ یہ ہے کہ ہم آپ کو نہیں پہچان سکے ہیں جیسا پہچاننا چاہیے، مگر اس جملہ کے اندر یہ مفہوم چھپا پڑا ہے کہ ہم نے خدا کو ایسا پہچانا ہے کہ کوئی ایسا پہچان ہی نہیں سکا، اور بھائی حضور ﷺ اگر اللہ تعالیٰ کے عارف نہیں ہوں گے تو کون ہوگا۔ تو آپ " أعرف الناس " تھے، اسی لیے " أعبد الناس " بھی تھے۔ معلوم ہوا کہ علم ومعرفت کا لازمی اثر عبدیت وتواضع ہے، اگر علم کے ساتھ تواضع نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ معرفت نہیں ہے صرف الفاظ ہے، تو نفوس میں اثر ہونا چاہیے صرف نقوش نہیں ہونا چاہیے اور صدور میں ہونا چاہیے صرف ستور میں نہ ہو، اسی لیے فرمایا کہ ﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ أُوْتُوْا الْعِلْمَ ﴾ (سورۂ عنکبوت آیت نمبر:۴۹) " في سطور الذين كتبت " نہیں فرمایا تو خلافت کی بنیاد علم ومعرفت ہے۔

خدا کے خزانے سے لینے کا ایک اہم اصول

تفسیرِ مظہری میں ایک بہت اچھا نکتہ لکھا ہے کہ جب فرشتوں نے یہ کہا کہ ﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا ﴾ (سورۂ بقرۃ، آیت نمبر:۳۲) یعنی جب اعتراف کیا تو اللہ میاں نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ ﴿ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ ﴾ (سورۂ بقرۃ، آیت نمبر:۳۳) معلوم ہوا کہ اب جو جان رہے ہیں وہ " لا علم لنا " کے نتیجہ میں ہے، تو نتیجہ یہ نکلا کہ جب ہم یہ کہیں گے کہ ہم

نہیں جانتے تو اللہ میاں علم کھولیں گے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک فقیر جب کسی بڑے در پر مانگنے کے لیے جاتا ہے تو جو حصہ اس کے کشکول کا بھرا ہوا ہوتا ہے وہ پیش نہیں کرتا ہے، اگر وہ بھرا ہوا کشکول پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے اس میں کون ڈالے گا، معلوم ہوا مانگنے کے لیے خالی ہونا ضروری ہے، اس لیے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس صفت سے فائدہ اٹھانا ہے اس سے اپنی نفی کردو، اگر خدا کے علم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو یوں کہو ہمارے پاس کچھ بھی علم نہیں اور پھر کوشش کرو علم کے لیے تو خدا کی طرف سے علم کا فیضان ہوگا، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی قدرتوں سے فائدہ اٹھانا ہے تو اپنا عجز ظاہر کرو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا مظہر بن جاؤ گے، تو اللہ تعالیٰ کی جس صفت سے فائدہ اٹھانا ہے اس کی نفی کرتے چلے جاؤ۔

لا موجود الا اللہ کا مطلب

اور چونکہ ساری صفات وجود سے متعلق ہیں یہ کمال ہے محققین صوفیاء کا کہ وہ اپنے وجود ہی کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا وجود ہے، یعنی اللہ کا باقی سب " لا موجود " اسی کو فرمایا کہ " لا موجود إلا اللہ " اب کوئی شخص کہے کہ اور چیزیں بھی تو موجود ہیں پھر " لا موجود إلا اللہ " کا کیا مطلب؟ دیکھو! بھائی چیونٹی کا وجود ہے اس کو آپ موجود کہیں گے نا، اور ہاتھی بھی موجود تو اب آپ ہاتھی کے مقابلے میں چیونٹی کے لیے کیا لفظ کہیں گے " لا موجود " بھائی وجود تو ہے اس کا، مگر اس کی نسبت سے اس کو کیا کہیں گے " لا موجود " تو اسی طرح کائنات کا وجود ہے، مگر خدا کی نسبت سے کچھ بھی نہیں، بلکہ اس کے دینے سے وجود ہے، اگر وہ چھین لے تو کچھ بھی نہیں یہ ہے مطلب " لا موجود إلا اللہ " کا، یہ مطلب نہیں ہے کہ جیسے وہ بھگوان گائے میں حلول کئے ہوئے ہے۔

اصل چیز علم کی برکت ہے

تو جس صفت سے فائدہ اٹھانا ہو اس کی نفی کردو اگر آپ نے یہ سمجھ لیا کہ میرے پاس بہت علم ہے تو وہ چند ظاہری حروف ہوں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم کا فیضان اور برکت نہیں ہوگی ، جیسے بہت سے لوگ قرآن وحدیث کی بگ اسٹڈی کرتے ہیں ، لیکن علم کی برکت نہیں ہوتی وہ ہم سے زیادہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں ، مگر علم کا نور نہیں ہے ان کے پاس ، وہاں صرف سطورِ الفاظ ہے تو الفاظ اور چیز ہے اور حقیقت اور چیز ہے۔

دیکھئے !ایک آدمی زمین پر بیٹھ کر ہوائی جہاز کی بات کررہا ہو اور ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہوائی جہاز کی بات کررہا ہو دونوں میں بڑا فرق ہے نا ، تو وہاں بھی یہی بات ہے، تو اپنے سے کمالات کی نفی ہوگی تو علم کے دروازے کھلیں گے تو علم ومعرفت بہت بڑی چیز ہے۔

نکتۂ رازی

اور واقعہ یہ ہے کہ علم کا عین علو کا پتہ دیتا ہے، عین سے علو کی طرف اشارہ ہے کہ علم آئے گا تو بلندی آئے گی اور علم کا لام لطف کا پتہ دیتا ہے اور میم مقبولیت کی خبر دے رہا ہے۔ اور امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں بندے کا خیال ہے کہ لام بیچ میں ہے معلوم ہوا کہ علم کے اندر گھسے گا تب لطف آئے گا سطحی علم میں لطف نہیں ہے ، اس لیے آپ دیکھیں قرآنِ کریم کا درمیان کیا ہے﴿ وَلْيَتَلَطَّفْ ﴾ (سورۂ کہف، آیت نمبر: ۱۹) اور مادّہ اس کا لطف ہے، معلوم ہوا کہ جو قرآنِ کریم کے اندر گھسے گا اسے لطف آئے گا، کیونکہ " وَلْيَتَلَطَّفْ " کا مادّہ ہی لطف ہے اور بابِ تفاعل سے ہے۔

ہدایت کے لیے قرآنِ کریم کافی ہے

اور حکیم سنائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی ابتدا باء سے ہے اور انتہا سین پر ہے " والنَّاسِ " تو باء اور سین کو ملاؤ تو بن جاتا ہے "بس"، گویا ادھر اشارہ ہے کہ سارے علوم اسی کے اندر ہے ہدایت کے لیے، بس یہی کافی ہے۔ (لطائفِ سورۂ یوسف) اور حدیث شریف اس کی شرح ہے، فقہ اس کا اثر ہے، یہ تو وہ لکھتے ہیں۔ اس میں ہمارا حاشیہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دلیل مانگے تو اسی دعوے میں دلیل ہے کہ "بس" کو الٹ دو تو "سب" آجائے گا۔

آج کل عوام علماء کا امتحان لیتے ہیں

کچھ پلے پڑ رہا ہے آپ لوگوں کے یا پریشان ہو رہے ہیں، ویسے تو یہاں سب ہوشیار لوگ بیٹھے ہیں کوئی وکیل صاحب ہے تو کوئی پتہ نہیں کیا کیا صاحب ہیں، پہلے زمانے میں ہوتا یہ تھا کہ شہری لوگ دیہاتیوں کو اُلّو بناتے تھے اور اب ہم نے دیکھا گجرات میں کہ دیہات والے مدھ (شہد) لے کر آتے ہیں اور شہریوں کو اُلّو بناتے ہیں، اسی طرح اب عوام جو ہے علماء کا امتحان لیتے ہیں، کیسے؟ پہلے وہ آپ سے مسئلہ پوچھیں گے پھر جب آپ کا مسئلہ ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو پھر کہیں گے کہ فلاں نے یہ لکھا ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے ایک آدمی نے ایسے ہی کہا تو حضرت نے اس سے کہا ہم سے جھک مارنے پوچھا، اسی طرح آج کل لوگوں کا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ دس جگہ سے فتوے منگائیں گے نو جگہ کا جواب ان کے نفس کے اور مزاج کے خلاف ہوگا تو اسے نہیں مانیں گے اور ایک جگہ کا جواب ان کے مزاج کے مطابق ہوگا اسے لوگوں کو بتاتے پھریں گے کہ دیکھو یہ فتویٰ آیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دین کو بھی آدمی اپنی نفسانیت کا ذریعہ بنالیتا ہے، اب چاہے وہ اہلِ علم ہو یا عوام ہو پہلے یہ چیزیں نہیں تھیں، اس لیے بڑی برکت تھی، پہلے انقیاد تھا، انکساری تھی، تو آدمی اپنے کو مٹائے تو فائدہ ہوتا ہے۔

فیض کی مثال پانی کی طرح ہے

علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فیض کی مثال پانی کی طرح ہے اور پانی اپنی فطرت سے نیچے چلتا ہے از خود اوپر نہیں جائے گا، آپ بائی فورس اوپر لے جائیں وہ الگ بات ہے، لیکن پھر اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں تو وہ نیچے کی طرف جائے گا تو فرماتے ہیں کہ فیض کی مثال پانی کی طرح ہے اور پانی پستی کی طرف چلتا ہے، اب جس کو پانی سے فائدہ اٹھانا ہے اس کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا تو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اسی طرح استاذ اور شیخ کا بھی حال ہے کہ ان کے سامنے آدمی کو جھکنا پڑے گا تو ان سے فائدہ ہوگا، ویسے اصل فیض پہنچانے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، وہ تو بہانا بن گیا منبعِ فیاض جسے کہتے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ ہے (ملفوظاتِ کمالاتِ اشرفیہ) مگر یہ ایک بہانا ہے اس کے لیے تو شیخ سے عقیدت ہونی چاہیے عقیدت ہوگی تو فائدہ ہوگا چونکہ نفع عقیدت پر منحصر ہے۔

نفع عقیدت پر منحصر ہے

ایک شخص تھا وہ ڈاکو تھا جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس نے سوچا کہ اب تو میں ڈاکہ ڈال نہیں سکتا، لہٰذا کوئی ڈھونگ رچانا چاہیے تو وہ ایک پہاڑ پر جا بیٹھا، اب لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ فلاں باوا بہت پہنچے ہوئے ہیں تو کچھ آدمی آئے اور وہ اس سے بیعت ہوگئے اس نے ان کو ذکر وشغل کی تلقین کی یہ کرتے رہیں، کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک درجہ عطا فرمایا تو انہوں نے سوچا کہ ہم اپنے شیخ کا درجہ دیکھیں تو مراقبہ کیا پھر کہنے

لگے کہ شیخ کا درجہ اتنا اوپر ہے کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا ہے، بہت بلند ہے، پھر وہ شیخ کے پاس آئے اور کہا حضرت ایسا معاملہ ہے تو انہوں نے کہا بھائی دیکھو! کہاں شیخ اور کہاں میں، میں تو ویسے ہی ایک لوفر آدمی تھاڈاکہ ڈالتا تھا، اب بوڑھا ہوگیا ہوں تو کھانے اور کمانے کی یہ ایک شکل اختیار کی تھی میں نے، البتہ تمہیں جو ترقی ہوئی ہے وہ تمہارے اچھے گمان کی وجہ سے ہوئی ہے، اب تم صاحبِ نسبت ہوگئے ہو، لہٰذا تم مجھے بیعت کرلو(اکابر کا سلوک واحسان ص: ۴۵) تو معلوم ہوا کہ فائدہ پہچانے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، مگر جس کو ذریعہ بنایا ہے اس سے عقیدت ہونا ضروری ہے، تاکہ اس سے نفع ہو ویسے وہ کچھ نہیں ہے وہ تو ایک بہانہ ہے اصل فائدہ پہچانے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ تو عقیدت یہ سب سے بڑی چیز ہے اور اس زمانے میں یہی چیز نہیں ہے۔

آج کل کمالات پر نہیں نقائص پر نظر ہوتی ہے

اس زمانے میں ظرف بہت کم ہے اس لیے کمالات پر نظر نہیں ہوتی، نقائص پر ہوتی ہے، اسی لیے فیض سے محروم رہتے ہیں فیض نہیں ہوتا۔ دیکھئے! جتنا تنقیدی مزاج ہوگا اتنی محرومی رہے گی اور بات یہ ہے کہ یہ راستہ بڑا نازک ہے، اس لیے نیت، عقیدت، عظمت سب ہونا چاہیے، ویسے شیخ کوئی معصوم نہیں ہوتے معصوم تو پیغمبر ہوتے ہیں۔

عام حال کی زندگی میں ان کی اتباع کرو ویسے تھوڑی بہت کمزوری تو ہر ایک میں ہوتی ہے، مگر عام طور پر ہوتا کیا ہے کہ لوگ نقائص ہی دیکھتے ہیں اس لیے محروم رہتے ہیں فائدہ اٹھا نہیں سکتے۔

میں جب ڈابھیل میں تھا تو وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ انہوں نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کا اور مولانا عثمانی رحمہ اللہ وغیرہ کا زمانہ پایا، لیکن بہت سوں نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا کچھ لوگوں نے اٹھایا۔ اچھا! اب بعد والوں سے وہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہم

نے تو ان کا دور دیکھا ہے، یعنی شاہ صاحب رحمہ اللہ اور مولانا عثمانی رحمہ اللہ وغیرہ کا یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تم سے کیا فائدہ اٹھائیں گے تو اُن سے بھی نہیں اٹھایا اور اِن سے بھی نہیں اٹھایا، دونوں سے محروم رہیں تو ایسا ہوتا ہے۔

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے ایک ساتھی تھے وہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے بیعت تھے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے جیسا فائدہ اٹھانا چاہیے نہیں اٹھایا انہوں نے۔ اور حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ سے فائدہ اس لیے نہیں اٹھایا کہ یہ تو ہمارے ساتھی ہیں تو یہ بھی حجاب بن جاتا ہے، بلکہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ''اے تو امارو دوستار چھے'' (وہ تو ہمارا دوست ہے) تو جو مقصود ہے وہ نہیں ہوتا عام طور پر محرومی رہتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا ہر معاملہ جلالی تھا

ہاں! جس کو اللہ تعالیٰ نواز دے تو اور بات ہے اور اس کے دین کا حال پوچھنا ہو تو موسیٰ علیہ السلام سے پوچھو، موسیٰ سے پوچھو خدا کے دین کا احوال ...

کہ آگ لینے کو جائے پیمبری مل جائے

تو آگ لینے گئے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور نبوّت مل گئی اور موسیٰ علیہ السلام کا سارا معاملہ ایسا ہی تھا آگ والا، یعنی جلالی کہ ان کے جتنے واقعات ہوئے ہیں ان سب میں آگ یعنی جلال کی کیفیت تھی۔

دیکھئے! حفاظت ہوئی تو تنور میں وہ بھی ناری اور دربار میں پہنچے تو وہاں بھی فرعون کو تھپڑ مارا، اور رسول بنا دیئے گئے تو دوپہر کے وقت پہنچے فرعون کے یہاں ڈنڈا لے کر دربان نے کہا ہمارے معبود سوئے ہوئے ہیں تو آپ نے دروازہ ٹھوکا وہ بھی جلال میں باہر نکلا انہوں نے دعوت دی تو پہلے تو اس نے ان کو پہچانا نہیں پھر کہنے لگا، اچھا! ﴿ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ○ ﴾ (سورۂ شعراء، آیت نمبر: ۱۹) کہ قبطی کو مار کر

بھاگے اور اب یہ بات کرتے ہو، پھر کہنے لگا جس کو قرآنِ کریم نے کہا کہ ﴿ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (سورۂ شعراء، آیت نمبر: ۲۳) تو آپ نے فرمایا: ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ (سورۂ شعراء، آیت نمبر: ۲۴)۔

تو غرض یہ کہ آپ کا معجزہ ظاہر ہوا وہ بھی ناری اور نبوت جب دی گئی اس وقت بھی ناریت کی شکل ظاہر ہوئی۔ اور ملک الموت آئے ان کو بھی طمانچہ مارا (متفق علیہ) کس پر بات چل رہی تھی بھائی؟ (حضرت نے یہاں حاضرین سے سوال کیا) تو بتلایا گیا کہ عقیدت پر بات چل رہی تھی، تو حضرت نے فرمایا کہ بات موسیٰ پر کہاں چلی گئی (پھر فرمایا کہ) بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات میں سے بات بات میں سے بات آنا شروع ہوتی ہے اور کہاں چل رہے ہیں وہ گم ہو جاتا ہے۔

ہدایت کے لیے طلب شرط ہے

دیکھئے! آپ ﷺ کو معراج ہوئی تو ابوجہل وغیرہ نے وہ باتیں آپ ﷺ کی زبانی خود سنی مگر نہیں مانا، اور ابوجہل حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ آپ نے سنا ہے وہ آپ کا ساتھی محمد جس پر آپ جان چھڑکتے ہو کیا کہتا ہے؟ اور پھر اس کی تفصیل عرض کی تو اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں اس پر ایمان لاتا ہوں (سیرۃ المصطفی، ج ۱) تو دیکھئے! ابوجہل نے براہِ راست ڈائریکٹ آپ ﷺ کی زبانی سننے کے باوجود تسلیم نہیں کیا اور ابوبکر نے اِن ڈائریکٹ سنا اور تسلیم کر لیا، تو معلوم ہوا کہ آدمی کو اگر ماننا ہو تو دیوار پر لکھی ہوئی نصیحت کو بھی مان لیتا ہے اور جب نہیں ماننا ہوتا ہے تو نبی کی زبانی سن کر بھی نہیں مانتا ہے، تو عقیدت اور طلب بڑی چیز ہے اور فائدہ انہی دو باتوں پر، یعنی عقیدت اور طلب پر منحصر ہے، تو اب اسی پر آج موقوف رکھیں بہت وقت ہو گیا ہے۔

مجلس نمبر (۷)

معجزاتِ نبوی ﷺ کی ایک جھلک

مجلس نمبر (۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک غلط سوچ

ہندوستان میں بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی انگلینڈ یا افریقہ گیا خلاص ، حالانکہ وہاں ان پر کیا گزرتی ہے وہ وہی جانتے ہیں ، انڈیا والے تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ ائیر پورٹ پر اترتے ہوں گے تو وہاں ان کا استقبال ہوتا ہوگا کہ ''او تمے آیوا'' (تم آئے) لو یہ پاؤنڈ، میں نے کہا ایسا نہیں ہے، میں نے کہا راتوں کو بیچارے اٹھتے ہیں صبح کو بھاگتے ہیں ،سردی میں اکڑتے ہیں اور پاپڑ بیلتے ہیں تب جاکے کچھ دنوں کے بعد کچھ ہوتا ہے ، ایسا نہیں ہے تمہاری طرح کہ کھا پی کے چار راستے پر بیٹھ گئے اور باتیں کررہے ہیں اور نظر پوسٹمین کی طرف ہے کہ وہ گذرتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ ''کئی منی آرڈر آویلو چھے کے نی'' (منی آرڈر آیا ہے کے نہیں) ۔

کام چور نہ بنیں

میں نے وہاں جوانوں سے پوچھا کہ تم لوگ جوان ہو بتاؤ تم کیا کام کرتے ہو؟ تو کہنے لگے کہ بس ایسے ہی بیٹھے ہیں ، میں نے کہا کہ وہ لوگ تو باہر جاکر بیچارے کھپے ہوئے ہیں اور تم ہو کہ دادا ، ماما ، چچا، بھائی اور فلاں اور فلاں کو خط لکھا ہے پیسے کے لیے وہاں سے آجائیں گے، یہ بہت بری بات ہے ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ میں کسی کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ آدمی نہ دین کا کام کرے نہ دنیا کا ۔ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ ہر شخص کام میں لگے، چاہے وہ کام دین کا ہو یا دنیا کا ۔ (انفاسِ عیسی ،ص:۵۹۶)

اور میرے شیخ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جس جوان کو بے کار دیکھتا ہوں اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے، آدمی اگر آخرت کا زیادہ کام نہ کرسکے تو دنیا کا ہی کرے، تاکہ دوسروں پر بوجھ نہ ہو۔ بھائی ہم دوسروں کی ہیلپ (مدد) نہیں کرسکتے تو دوسروں پر بوجھ بھی نہ بنیں۔

ہمارے حضرت یہ فرماتے تھے اور واقعۃً بڑے پتے کی بات ہے، آج آپ ہندوستان میں جاکر دیکھئے بہت سے نوجوان بہت کچھ کرسکتے ہیں، لیکن کچھ نہیں کرتے کہ ''باجی، یاماما، یا بھائی، مَوکّل ہے'' (بھیجیں گے) میں نے کہا وہاں ان پر کیا گذرتی ہے ان کو جاکر پوچھئے یہاں کتنی سردی ہوتی ہے اس میں لوگ کام کرتے ہیں۔ ویسے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی دستخط بڑی مضبوط ہوتی ہے جن سے کام چلتا ہے، تو میں نے یہ چیزیں وہاں جوانوں میں کہیں۔ میں نے کہا تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے میں نے تو فورین کے ملکوں میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور افریقہ میں بھی بیچارے روزی کے لیے پورے کھپ جاتے ہیں یہ تو کوئی بات ہوئی کہ تم دوسروں کے بھروسے پر بیٹھے رہو، بلکہ تم اپنے گھاڑے پسینہ کی کمائی کی عادت ڈالو یہ بہت برا ہے کہ آدمی دوسروں کے بھروسے پر رہے۔ مان لو کہ وہ بیمار ہوگیا یا اس کا انتقال ہوگیا تو کیا ہوگا؟ میں نے کہا یہ بے کاری بہت بری چیز ہے۔

ایک احتجاج ایسا بھی

میں نے وہاں مثال دی کہ جاپان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی جاپان کی ہے، کیوں؟ وہاں پر لوگ کام کرتے ہیں ٹیکنولوجی میں انہوں نے خوب ترقی کی ہے، وہاں حال یہ ہے کہ عام طور پر لوگ آٹھ گھنٹے کی بجائے بارہ گھنٹے کام کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں اور ملکوں کا حال یہ ہے کہ وہاں جو آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے وہ چار گھنٹے کام

کرنے کی سوچتا ہے اور وہاں جاپان میں اس کے لیے احتجاج ہوتا ہے کہ ہمیں آٹھ گھنٹے کی جگہ بارہ گھنٹے کام کرنے دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چلومت دوڑو، ہارڈ لائف جیو (فیضِ ابرار ج۹،ص: ۲۲۹) اور یہاں حال یہ ہے کہ بیٹھے ہیں چوراہے پر اور بیڑی پی رہے ہیں اور پوسٹمَین کے انتظار میں رہتے ہیں کہ ''کئی چھے کے نی'' (کچھ ہے کہ نہیں) میں نے کہا کہ کام کرنا چاہیے، ہاں! اگر کوئی رشتہ دار اپنی خوشی سے کچھ بھیج دے تو اور بات ہے۔

دین میں بہت گنجائش ہے

یہ تو دنیا کے لیے محنت کی بات ہے، دین کے لیے تو اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے کہ جس سے آدمی میں بصیرت پیدا ہو جس سے فہم پیدا ہو کہ آدمی اشارات سمجھے، کیونکہ دین میں بہت سی گنجائش ہوتی ہے بعض دفعہ آدمی یہ چاہتا ہے کہ ایک پکی بات بتا دی جائے حالانکہ اس میں بہت سی گنجائش ہوتی ہے تو یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔

علم کا کوئی کنارہ نہیں ہے

اور دین کا علم ایسا علم ہے کہ آپ پوری زندگی کتابیں دیکھیں، مگر بڑھاپے میں یہی کہیں گے کہ مجھے کچھ بھی نہیں آیا۔ میری ابھی پینتالیس سال کی عمر ہے میں نے علم کے حصول کے لیے کافی محنتیں کیں جتنی میں کرسکتا تھا، لیکن آج میرا اندازہ ہے کہ جو دین کا علم ہونا چاہیے وہ مجھے کچھ بھی نہیں آتا، میں نے ایک جگہ یہ بات کہی تو ایک صاحب کہنے لگے کہ جب تم یہ بات کررہے ہو تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ تو میں نے کہا وہ آپ جانے۔

دیکھو! ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ روپئے ہیں اور ایک آدمی کے پاس دس روپئے ہیں تو جس کے پاس دس روپئے ہیں وہ ایک لاکھ والے کو بہت مالدار سمجھے گا، لیکن یہ لاکھ والا کسی کڑور پتی کو دیکھے گا تو وہ اس کو بہت مالدار سمجھے گا اپنے مقابلہ میں، یہ ایک

مثال دے رہا ہوں، تو ہم نے چار لفظ پڑھے ہیں اور آپ کو یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ ہم نے بہت کچھ پڑھا ہے، لیکن جب ہم بزرگوں کو دیکھتے ہیں تو ہمارا ویسا ہی حال ہوتا ہے کہ اونٹ جو ہے اپنے کو بہت بڑا سمجھتا ہے، مگر جب پہاڑ کے پاس سے گذرتا ہے تو اس کو اپنی حقیقت کا احساس ہوتا ہے، اس لیے بھائی ہم تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم کو کچھ نہیں آتا، اس لیے کہ علم ایک سمندر ہے تو آدمی اس طرف توجہ کرے دھیان دے، اگر آدمی کو دو لفظ بھی آگئے تو بڑی بات ہے۔

بعض لوگ مذہبی علماء پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ دو دو تین تین گھنٹے بولتے رہتے ہیں بیان میں رُکتے ہی نہیں، تو میں نے اس کی ایک وجہ اپنے بعض بزرگوں سے سنی ہے کہ قرآن و حدیث کا علم ایک ایسا سمندر ہے کہ جو انلمیٹیڈ ہے، یعنی لامحدود ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں عالموں کا علم تو محدود ہے، مگر چونکہ اس کا جوڑ ادھر سے ہے (اللہ تعالیٰ سے) تو اس کا عکس اس پر پڑتا ہے تو وہ بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

حکیم فخر الدین صاحب رحمہ اللہ کی صحبت کا اثر

چنانچہ ہم نے ہمارے حکیم فخر الدین صاحب رحمہ اللہ کو برسوں دیکھا جب بیٹھو تب نئی بات، ہم سوچتے تھے کہ کتنی معلومات ہیں اوران کے پاس بیٹھنے سے ہمیں بھی الحمدللہ سیکڑوں کتب کا نچوڑ مل گیا، لیکن یہ کہ ہم نے ان کی صحبت میں بہت عظمت اور احترام سے بیٹھنے کا اہتمام کیا۔

علومِ نبوت ہی تسکینِ روح کا ذریعہ ہے

اور جب اصل شئی آجاتی ہے تو یہ شبہات واشکالات وغیرہ دور ہوجاتے ہیں، ورنہ تو ہر صبح نیا شبہ اور ہر شام نیا اشکال آدمی کو ہوتا رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو دین کی صحیح

سمجھ دے اور جب تک ادھر کا علم نہ ہو جس کو نبی واضح کرتا ہے دل کو تسکین نہیں ہوتی ، ورنہ حواس کا علم وہ صرف حواس کی تسکین کرتا ہے روح کی نہیں اور موت کے بعد یہ علم نافع نہیں ہے، تو ایمان اور دین کا علم مل جانا بہت بڑی چیز ہے۔

ألا بذكر الله تطمئن القلوب

ورنہ آج دنیا اپنے نظام سے خود پریشان ہے۔ اسٹالین کے بارے میں ہے کہ وہ موت سے پہلے کہتا تھا اللہ اللہ، تو کسی نے کہا کہ تم تو اللہ کو مانتے نہیں پھر کیوں اس کا نام لیتے ہو؟ تو کہا مانتا اب بھی نہیں ہوں ، مگر مجھے اس نام کے لینے سے سکون ملتا ہے۔
(خطباتِ حکیم الاسلام ج ۴، ص: ۴۲۲)

سوال: یہاں ایک آدمی نے سوال کیا کہ حضرت معجزات کے مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالیں۔

معجزہ فعلِ خداوندی ہوتا ہے

حق تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معجزات دئے ہیں۔ معجزہ کا معنی ہوتا ہے عاجز کر دینے والا ، کیونکہ معجزہ عام انسانی قوتوں سے بالاتر شئی ہوتی ہے اور اس کا توڑ کوئی نہیں کرسکتا ، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ معجزہ فعلِ خداوندی ہوتا ہے، حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے (درسِ قرآن ص: ۲۵۳) اس لیے دنیا کی کوئی طاقت نبی کے معجزہ کو نہیں توڑ سکتی ، اور پچھلے نبیوں کو جو معجزات دیئے گئے تھے وہ سب عملی معجزات تھے ، مگر نبی کریم ﷺ کو علمی اور عملی دونوں قسم کے معجزات دئے گئے ، آپ ﷺ کے معجزات کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے اور ہر شئی سے اس کا تعلق ہے ، میں اس کی طرف کچھ اشارے کرتا ہوں۔

آپ ﷺ کے معجزات کی ایک جھلک

آپ ﷺ کا ایک معجزہ سورج کے متعلق ہے کہ آپ ﷺ کا سر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ران پر تھا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عصر کی نماز باقی تھی اور سورج غروب ہونے لگا۔ تو امامِ طحاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کے کہنے پر سورج واپس لوٹ آیا (مشکل الا ثار، ج ۲، ص:۱۱) اب اس میں کچھ فلسفیانہ بحثیں ہوسکتی ہیں، مگر میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں جاتا۔

اسی طرح چاند کا معجزہ شقِ قمر جسے کہتے ہے (بخاری شریف) وہ سب کو معلوم ہے، ہندوستان کے ایک راجہ نے بھی اس کو دیکھا تھا اور پھر اس کی تحقیقات کے لیے اس نے آدمی بھی بھیجے تھے، اسی طرح بجلی کا معجزہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت نے ایک متکبّرینِ قریش کے پاس دعوت نامہ بھیجا تو اس نے اس کا مذاق اڑایا اور کہنے لگا کہ اللہ میاں کاہے کے ہیں؟ سونے کے چاندی کے لوہے کے پیتل کے کاہے کے ہیں؟ بس! اس نے یہ جملے کہے تھے کہ آسمان سے ایک بجلی آئی اور اس کے سر کو تن سے جدا کر دیا۔
(نسائی شریف)

اسی طرح بادلوں میں بھی معجزہ ظاہر ہوا۔ مؤطا امام مالک وغیرہ میں وہ خطبہ والی روایت مشہور ہے بارش کے سلسلے میں، اسی طرح پانی میں بھی معجزہ ظاہر ہوا۔
(بخاری ومسلم)

اسی طرح ہواؤں میں معجزہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ظاہر ہوا۔ (بخاری شریف)

اسی طرح زمین میں معجزہ ظاہر ہوا وہ ہجرت کے وقت کا واقعہ سراقہ بن مالک کا زبان زد ہے (بخاری ومسلم) اور آگ میں معجزہ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایک بادشاہ نے ایک صحابی کو آگ میں ڈال دیا وہ اس میں سے صحیح سالم نکل آئے،

اور وہاں سے مسجدِ نبوی میں تشریف لائے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا کہ سنا ہے کہ ایک شخص کو فلاں بادشاہ نے فلاں جگہ آگ میں ڈالا تھا اور وہ اس میں سے صحیح سالم نکل آئے، انہوں نے کہا کہ بالکل صحیح واقعہ ہے اور وہ میرا ہی واقعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے کہا بالکل میرا ہی واقعہ ہے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو سب لوگوں کے درمیان بٹھایا اور رو پڑے اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے حضور ﷺ کی امت میں امتیوں سے وہ چیزیں کر دکھائی اور ظاہر فرمائی کے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ظاہر ہوئی تھیں۔
(کتاب النبوات، ص: ۲٦۵)

تو یہ سب شکل ہے، اور حدیث شریف میں ہے "أسرع يا مؤمن فإن نورك اطفئا ناري" (انفاسِ عیسی، ص: ۲۰۸، و ۵۴۸ مرقاۃ) کہ ''مؤمن جب پل صراط سے گذرے گا تو جہنم چلائے گی اور کہے گی جلدی گذرو کہ تمہارے پیروں کی ٹھنڈک سے میں ٹھنڈی ہوتی جارہی ہوں'' یہ وضو کے آثار ہیں۔

اور درختوں میں معجزہ کہ درختوں پر خوشے تھے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہاتھ میں آ گیا۔ اسی طرح ضرورتِ طبعی پیش آئی تو ایک صاحب کو حکم دیا کہ جاؤ اور فلاں درخت کی ٹہنی پکڑ کر لے آؤ تو وہ زمین کو پھاڑتے ہوئے جڑوں کے ساتھ آیا اور آپ نے اس کو آڑ کے طور پر استعمال کیا اور جب ضرورت سے فارغ ہوئے اور اسے جانے کا حکم دیا تو وہ چلا گیا اپنی جگہ پر۔ (طبرانی و مسلم)

بہائم میں اثر کہ ایک اونٹ نے بہت عاجز کر رکھا تھا اس کے مالک کو آپ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے تو آیا اور فوراً مسخر۔ (مسندِ احمد و دارمی)

آپ ﷺ کے ایک غلام تھے سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ جنگل میں بچھڑ گئے ایک شیر

آیا تو آپ نے اس سے کہا کہ میں محمد ﷺ کا غلام ہوں تو وہ آپ کو اپنے ساتھ لے کر چلا اور انہیں ایک معروف راستہ پر چھوڑ دیا کہ اب یہاں سے چلے جاؤ۔ (شرح السنۃ)

تو میں عرض کر رہا تھا کہ معجزہ فعلِ خداوندی ہوتا ہے، ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھ پھوٹ گئی آپ ﷺ نے اس پر اپنا لعابِ مبارک لگا کر رکھ دیا اس کی جگہ پر تو وہ پہلے سے زیادہ روشن ہوگئی۔ (بخاری و مسلم)

زینب بنتِ اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آئیں تو از راہِ شفقت آپ ﷺ نے ان کے منہ پر کلی کی تو بڑھاپے تک ان کے چہرے کی رونق نہیں گئی اور بالوں میں سے سیاہی نہیں گئی اور منہ میں سے دانت نہیں گئے۔ (استیعاب)

نبی کریم ﷺ کے پاس ایک لکڑی کا پیالہ تھا اور دیکھئے پیغمبر کے ہر فعل میں کوئی مصلحت ہوتی ہے تو سردی کے زمانے میں آپ ﷺ اس میں کبھی کبھی پیشاب فرماتے تھے اس کو ایک خادمہ نے پی لیا۔ (حاکم و دارِ قطنی)

بعض اربابِ حدیث لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان کی سات پشتوں سے مشک کی خوشبو آتی رہی اور یاد رکھئے پیغمبروں کا فضلہ بھی ناپاک نہیں ہوتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کے فراغت کے بعد میں جب بیت الخلاء جاتی تھی تو وہاں خوشبو کے سوا کچھ نہیں پاتی تھی۔ (خصائصِ کبری، ص: ۷۰)
اور معلوم ہونا چاہیے کہ پیغمبروں کے فضلات کو زمین فوراً نگل لیتی ہے۔

پیغمبر خلقاً اور خلقۃً کامل ہوتا ہے

اور پیغمبر اپنی ظاہری ہیئت میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ کوئی عضو ان کا ایسا نہیں ہوتا جو موجبِ نفرت ہو، کیونکہ ان کی محبت ایمان کے لیے لازم ہے، اس لیے پیغمبر کی کوئی ادا کوئی عضو موجبِ نفرت نہیں ہوتا۔

''قصص القرآن'' میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت کے اسباب کیا تھے اس پر طویل بحث کی ہے کہ زبان یہ نہیں تھی وہ نہیں تھی اور بچپن میں منہ میں انگارا لے لینے کا واقعہ وغیرہ، پھرانہوں نے اس میں ترجیح اس کو دی ہے کہ لکنت پیدائشی تھی، میں نے اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے کہ " فيه نظرٌ "۔

کیونکہ اصول میں اس کی تشریح ہے کہ پیغمبر خلقاً اور خلقۃً کامل ہوتا ہے، اس لیے یہ بات مجروح معلوم ہوتی ہے مولانا کی تحقیق اپنی جگہ، مگر ہماری تحقیق یہ ہے کہ پیغمبر خلقاً اور خلقۃً کامل ہوتا ہے پیغمبر کا کوئی عضو ناقص نہیں ہوتا، کیونکہ پیغمبر کی محبت ایمان کی اَساس اور بنیاد ہے۔تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ سب چیزیں ظاہر ہوئیں بطورِ معجزہ اور آج کی یہ جو ترقیات ہیں ان کو معجزہ سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

مثلاًراکٹ ہے اس کو براق سے کیا نسبت، اسی طرح آج کل ہوائی جہاز ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوائی تخت رکھا تھا اور وہ ایسے ہی چلتا تھا بغیر پیٹرول کے، ایسا بھی نہیں کہ پیٹرول نہ ہوتو مصیبت ہوجائے۔حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صبح کو دمشق سے اپنے تخت اور بساط پر بیٹھ کر ہوا میں روانہ ہوتے اور اصطخر فارس میں اتر کر قیلولہ کرتے اور دمشق اور اصطخر کے درمیان تیز رفتاری کے ساتھ کامل ایک ماہ کی مسافت ہے۔ پھر شام کو اصطخر سے روانہ ہوتے اور رات کابل میں بسر کرتے، اور اصطخر سے کابل تک تیز رفتاری کے ساتھ ایک ماہ کی مسافت ہے۔آپ ایک دن میں دومہینہ کی پیدل مسافت طے کرتے تھے۔

(معارف القرآن ادریسی ج٦، ص: ۳۵۵،۳۵٦)

سوال: ایک آدمی نے عرض کیا کہ حضرت اسمِ اعظم کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں۔

اسمِ اعظم

فرمایا کہ اسمِ اعظم بھی عجیب ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں جس میں شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اسم " اللّٰہ " یہ اسمِ اعظم ہے۔ (مرقاۃ ج۱، ص:۷۵)

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ " الرحمن " یہ اسمِ اعظم ہے۔ اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ " بدیع السموت والأرض " اسمِ اعظم ہے (کشکولِ معرفت) ایک قول یہ ہے کہ " ذو الجلال والإکرام " یہ اسمِ اعظم ہے (روح المعانی، پارہ: ۲۷، ص: ۱۱۰)۔ ایک قول یہ ہے کہ "یا حي یا قیوم" یہ اسمِ اعظم ہے (جواہر القرآن) اور ایک قول یہ ہے کہ " صمد " یہ اسمِ اعظم ہے (درِ نظیم، ص: ۳۴) اور حق یہ ہے کہ اس کو چھپا دیا ہے، تاکہ ہر اسم اسمِ اعظم ہو۔

چوہے کی حفاظت نہیں ہوئی تو اسمِ اعظم کی حفاظت کیا کروگے

ایک بزرگ کو اسمِ اعظم معلوم تھا ایک آدمی ان کے پاس گیا اور کہا کہ مجھ کو اسمِ اعظم بتائیے، کہا تم اس کے اہل نہیں معلوم ہوتے، اس نے اصرار کیا تو کہا اچھا پہلے ایک کام کرو یہ پیالہ فلاں آدمی کو پہنچا کہ آؤ، مگر دیکھو! اسے کھولنا مت مگر انسانی مزاج ہے کہ " الإنسان حریص فیما مُنِعَ " تو اسے خیال آیا کہ دیکھوں تو صحیح کیا ہے، اس نے اسے کھولا تو چوہا تھا وہ نکل کے بھاگ گیا، اب بڑا پریشان کہ وہاں جائے تو لے کر کیا جائے اور ویسے جائے تو منھ لے کر کیا جائے۔ بہر حال! آئے اور آکر معذرت کی تو بزرگ نے کہا بس تم اس کے اہل نہیں ہو، جب اتنا چوہا تم سے برداشت نہیں ہوا تو اسمِ اعظم کو کیسے برداشت کروگے (دلچسپ حیرت انگیز واقعات، ص ۱۳۰، ۱۳۱)۔

اسمِ اعظم کے بارے میں رازی کا رجحان

بہرحال ! اور امامِ رازی رحمہ اللہ نے تفسیرِ کبیر میں یہ ثابت کیا ہے کہ " حي قيوم " اسمِ اعظم ہے اور لکھا ہے کہ غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے جو الحاح وزاری کے ساتھ دعا کی اس میں یہی " حي قيوم " کو استعمال کیا تھا۔اور پہلے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ مشائخ مرید کو اپنے سامنے بٹھاتے تھے اور اس کے سامنے اسمائے حسنیٰ پڑھتے تھے، جس اسم پر اس پر کیفیت طاری ہوتی اس کو وہ اسم بطورِ ورد کے بتلاتے۔

فہمائش کا عجیب انداز

تفسیرِ کبیر پر سے ایک بات یاد آئی امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ہدہد کو خط لے کر بلقیس کے پاس بھیجا تو وہ طاقچہ میں سے داخل ہوا اور بلقیس کے سینے پر خط ڈال دیا اور آپ نے ہدہد کو تاکید کی تھی کہ خط رکھنے کے بعد ذرا دور ہٹ کر دیکھتے رہنا کہ وہ کیا کرتی ہیں، جب وہ اٹھیں تو اس نے دیکھا کے سینے پر خط پڑا ہوا ہے، حالانکہ اس کے روم میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی جا نہیں سکتا تھا، بڑی جلالتِ شان کی عورت تھیں، تو اس نے اپنے خاص لوگوں کو جمع کیا کہ ﴿ إِنِّيْ أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيْمٌ ٥ إِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَإِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥ ﴾ (سورۂ نمل، آیت: نمبر ۲۹، ۳۰) کہ مکرم کتاب آئی ہے سلیمان کی طرف سے۔تو امام رازی رحمہ اللہ نے سوال اٹھایا ہے اس مقام پر کہ سلیمان علیہ السلام نے " إنه من سليمن وإنه بسم الله الرحمن الرحيم " کیوں لکھا؟ یعنی ابتداء اپنے نام سے کیوں کی ؟ پھر اس کا جواب خود دیا ہے کہ اصل میں وہ متکبرہ تھیں بہت، تو سلیمان علیہ السلام نے سوچا اگر میں خدا کے نام سے شروع کروں تو ہوسکتا ہے وہ اس کی توہین کرے، تو اس کی توہین ہو اس کے بجائے اچھا

یہ ہے کہ ابتداء میرے نام سے ہو۔ پھر اس میں عجیب تطبیق دی لکھتے ہیں کہ اوپر جو بڑا کور تھا اس پر سلیمان علیہ السلام نے لکھا تھا" إنه من سليمن "اور اندر جب کھولا تو" بسم الله الرحمن الرحيم " تھا، عجیب وغریب تطبیق دی۔

خیر! پھر وہ بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں آئیں تو ایک حوض تھا وہاں اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے کانچ بچھا دیا اور خود حوض کے ایک طرف پر بیٹھ گئے، اب جب وہ آئیں تو اس نے دیکھا کہ پانی ہے تو اس نے پائینچے اٹھائے اور پھر پاؤں رکھا تو وہ تو کانچ تھا، تو اسے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی، چونکہ وہ بت پرست تھیں تو سلیمان علیہ السلام نے اس کو سمجھایا کہ اگر چہ تم بڑے عہدہ پر ہو، لیکن تمہاری فہم ماری گئی ہے کہ جیسے تم نے کانچ کو پانی سمجھا، حالانکہ وہ پانی نہیں ہے ایسے ہی تم نے سورج کو معبود سمجھا، حالانکہ وہ معبود نہیں ہے وہ تو سورج میں خدا کا عکس پڑا ہے، اس لیے وہ روشن ہو گیا، فہمائش کا عجیب انداز اختیار کیا۔

اور دیکھئے! اگر سورج کی روشنی اس کی اپنی ذات میں ہوتی تو گرہن کے وقت وہ بے نور نہ ہوتا، اگر چہ گرہن کے اسباب سائنس کچھ بھی بیان کرے کہ یہ ہوا وہ ہوا، مگر ہوا تو صحیح۔

تو غرض یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے معاملات بڑے عجیب ہوتے ہیں، اور معجزات کو بعض لوگوں نے کوشش کر کر کے عقلی طور پر ثابت کرنا چاہا ہے اور دونوں طرف لوگ گئے ہیں، مگر راجح قول یہ ہے کہ معجزہ نام ہے اس کا کہ جہاں عقلِ انسانی دم توڑ دیتی ہے، تو پیغمبر کے معاملات ہی عجیب ہوتے ہیں اور پیغمبر کے معجزات میں بہت قوت ہوتی ہے۔

ایک عورت کا دعویٰ نبوت

ایک عورت تھی بھوپال میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، کسی نے کہا آپ کو معلوم نہیں

حدیث شریف میں ہے " لا نبي بعدي " (سننِ ابنِ ماجہ) تو وہ کہنے لگی ، " لانبي بعدي " ہے " لا نبية بعدي " نہیں ہے ، یعنی میرے بعد کوئی مرد نبی نہیں ہوگا یہ فرمایا ہے عورت کی نفی نہیں ہے ۔اس بیوقوف سے کوئی پوچھتا کہ جب مردوں میں نفی ہے تو عورت کا تو سوال ہی نہیں ہوتا ، کیونکہ نبوت تو مردوں ہی میں ہے۔

سیوطی رحمہ اللہ کا عشقِ قرآن

تو قرآنِ کریم میں عجیب عجیب انداز میں سب چیزیں بیان کی گئی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایسی کتاب ہے جس کی نظیر نہیں ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ایک تفسیر لکھنے کا قصد کیا '' مجمع البحرین و مطلع البدرین'' پھر اس پر مقدمہ لکھنا شروع کیا انہوں نے ، وہ اس وقت چار جلدوں میں شائع ہوا ہے ، اس میں تقریباً اٹھاسی چیزوں سے انہوں نے بحث کی ہے ، ان کی ایک اور کتاب '' اتقان'' ہے وہ بھی کافی ضخیم ہے ، مگر اس میں بھی تفسیر کی تو نوبت ہی نہیں آئی ، تو بڑی محنتیں کی ہیں لوگوں نے ۔

محدثین کی خدماتِ حدیث کی ایک جھلک

بعض محدثین کے حالات میں ہے کہ انہوں نے اپنے قلم کا تراشہ جمع کیا اور وصیت کی کہ ہمیں جب انتقال کے بعد غسل دیا جائے تو اس پانی میں یہی تراشہ ڈالا جائے۔

ابنِ جوزی رحمہ اللہ نے بھی یہی وصیت کی تھی ۔(ابنِ خلکان ج ۳ ص ۳۲۱)

ہمارے ایک ملنے والے ہیں ان کو چائے سے بڑی مناسبت ہے تو وہ کہنے لگے کہ میرے غسل کے لیے جب گرم پانی تیار ہو تو اس میں ذرا سی چائے کی پتی بھی ڈالی جائے ، لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔

پیغمبروں کو طاغوتی قوتوں پر قوت حاصل ہوتی ہے

تو پیغمبر کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، آپ ﷺ کی حضرت رُکانہ سے کشتی ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کو پچھاڑ دیا (بیہقی) بعد میں وہ مسلمان بھی ہوگئے، تو پیغمبروں کو ان کے زمانے کی جتنی طاغوتی طاقتیں ہوتی ہیں سب پر طاقت اور غلبہ ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سحر کا غلبہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر آپ کو طاقت دی کہ آپ کا عصا جب ازدہا کی شکل اختیار کرتا تھا تو اس کے منھ میں فرعون کا پورا محل آجاتا تھا۔

اچھا! عصا کی قرآنِ کریم نے دوصفت ذکر کی ہے: ایک یہ کہ ﴿ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (سورۂ شعراء آیت: نمبر۳۲) اور دوسری ﴿ كَأَنَّهَا جَآنٌّ ﴾ (سورۂ نمل آیت نمبر: ۱۰) ''جان'' کہتے ہیں بالکل دبلا پتلا سانپ، اور ادھر '' ثعبان مبین '' بہت موٹا، تو اس کی تطبیق یہ ہے کہ ابتداء یہ، انتہاء وہ۔ اور اس سے اچھی تطبیق یہ ہے کہ پھرتی ایسی تھی جیسے پتلے سانپ کی ہوتی ہے اور جسامت میں موٹا سانپ۔ اور لکھا ہے کہ فرعون نے جب اس کو دیکھا تو اس کو دست لگ گئے، حالانکہ اس کو چارسو سال تک سر میں درد نہیں ہوا تھا۔

انسانوں کے علوم میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ ﴿ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴾ (سورۂ طٰہٰ آیت نمبر: ۱۷) تو فرمایا کہ ﴿ قَالَ هِيَ عَصَايَ ﴾ (سورۂ طٰہٰ آیت نمبر: ۱۸) یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم تھا فرمایا کہ یہ میرا عصا ہے اس کے بعد اسے ڈالنے کا حکم دیا اور پھر پوچھا تو موسیٰ علیہ السلام کا علم بدل گیا، تو معلوم ہوا کہ دنیا کے جو علوم ہیں اس میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے، کبھی کچھ پھر کچھ پھر کچھ۔

علمِ الٰہی میں سب حقائق پہلے سے ہوتے ہیں

مگرعلمِ الٰہی میں سب حقائق پہلے سے ہوتے ہیں جیسے ایک ،دو ،تین ،چار ،پانچ ، چھ ہے۔ایک کے بعد دوسرا ، اس طرح اسی لیے لکھا ہے بعض محققین نے کہ ازل اور ابد دو پُٹھے ہیں ، جیسے کتاب کے دو پٹھے ہوتے ہیں اور یہ زمانہ جو ہے دن اور رات گویا یہ اوراق ہیں ، اب ہم کتاب پڑھتے ہیں اس میں جو پڑھ چکے ہیں وہ تو ہے ماضی ، اور جو آگے پڑھیں گے وہ مستقبل ،اور جو پڑھ رہے ہیں وہ حال ،مگرکوئی ایسا بھی ہو کہ جس کی نظر سارے اوراق پر ہو اور اَزل سے اَبد تک ہو ،تو وہ حق تعالیٰ کی ذات ہے کہ سب پر اس کی نظر ہے تو انسانی علم وہ تو بہرحال محدود ہے۔

خدا کی تمام صفتوں کا نچوڑ دو صفتیں ہیں:

اچھا !اس میں بھی عجیب بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سارے معجزات میں دو معجزات بہت مشہور ہیں ، یدِ بیضا ،اور عصائے موسیٰ ،اور معجزہ جو ہے فعلِ خداوندی ہوتا ہے(درسِ قرآن ص:۲۵۳) جیسا کہ ہم نے شروع میں بات کہی تھی اور افعال کی وجہ صفت ِ خداوندی ہے۔مثال کے طور پر آپ کسی کو مارے تو اب یہ جو مارا یہ فعل ہے اور اس کی پشت پر غضب ہے ،تو معجزہ فعلِ خداوندی ہے اور اس کے پیچھے صفتِ خداوندی ہے اور تمام صفتوں کا نچوڑ دو چیزیں ہیں: غضب اور رحمت ۔تو عصا جو ہے خدا کی صفتِ غضب کا ظہور ہے ، اسی لیے جہاں ڈنڈا دکھایا بس طبیعت خوش ، اور یدِ بیضا ،اللہ تعالیٰ کی صفت ِ رحمت کا ظہور ہے کہ نظر پڑی تو بس یہ ہٹنے کو تیار نہیں۔

عصائے موسوی کے چُرانے کا ارادہ اور اس پر تنبیہ

مولانا روم رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ لیٹے ہوئے

تھے، دو آدمی وہاں سے گذرے اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا وہاں قریب میں جو درخت تھا اس سے لگا رکھا تھا، تو وہ دو آدمی کہنے لگے کہ ان کا سارا معاملہ اسی عصا سے متعلق ہے، لہٰذا ہم یہ ڈنڈا ہی لے جائیں، ابھی یہ ارادہ کیا انہوں نے اور اس کی طرف بڑھے تھے کہ وہ عصا سانپ بن کر دوڑا ان کے پیچھے، یہ کہنے لگے کہ مرے اب تو اور بھاگے تو برابر دوڑایا، اس نے ان کو اب انہوں نے دوڑتے ہوئے دُعا کی کہ اے اللہ! ہم اپنے اِس فعل سے توبہ کرتے ہیں تو وہ عصا وہیں کھڑا ہوگیا، یہ معجزہ حسی تھا۔

مولانا روم رحمہ اللہ نتائج کے امام تھے

تو مولانا روم رحمہ اللہ اس واقعہ سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آپ ﷺ قبر مبارک میں آرام فرما ہیں اور آپ کا معجزہ قرآنِ کریم آج بھی زندہ تابندہ ہے، اب جو اس کے متعلق بدخواہی کرے گا تو نتیجۃً اس کے لیے بربادی ہے، جیسے وہاں معاملہ حسی طور پر تھا یہاں معنوی طور پر ہے، یعنی دیر سویر حالات پھٹکار نتیجۃً اس کے لیے ہے۔ عجیب نتیجہ اخذ کیا اور نتائج میں تو امام تھے وہ بڑے آدمی تھے، تو معجزہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی مستقل ایک دین ہے۔

امت کا مزاج پیغمبر کا عکس ہوتا ہے

جالینوس کو کسی نے خبر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد اندھے کی آنکھ پر ہاتھ پھیرتے ہیں تو وہ بینا ہو جاتا ہے، اس نے کہا طِب میں آج تک اس کا علاج دریافت نہیں ہوا، اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو وہ نبی ہیں، چونکہ اُس زمانے میں طِب کا غلبہ تھا، اِس لیے آپ کو معجزہ بھی ایسا ہی دیا گیا، اور دیکھئے! امت کا مزاج پیغمبر کا عکس ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی کی چڑیا بناتے تھے اور اُس میں پھونک مارتے تھے تو وہ

زندہ ہوکر اڑ جاتی تھی ، گویا وہ خبر دے رہے تھے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہو کہ وہ مٹی کی چڑیا پر پھونک مارے اور وہ چڑیا بن کر اڑ جائے ، تو اگر وہ خود آسمانوں میں اڑ جائے تو کونسی بڑی بات ہے۔ (فیضِ ابرار، ج۱۰،ص:۱۸)

تو یہ معجزہ ان کا ظاہر ہونے والا تھا کہ وہ آسمانوں پر تشریف لے جانے والے تھے، اِس لیے معجزہ بھی ایسا ہی دیا گیا۔ یہ دوسری وجہ تھی یہ معجزہ دئے جانے کی اور چونکہ انہوں نے مٹی کی چڑیا بنا کر آسمان میں اڑائی تو آج ان کی قوم بھی آسمانوں میں لوہے اور پیتل کی چڑیا، یعنی ہوائی جہاز بنا کر اُڑا رہی ہے، یہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی تعبیر ہے۔

اور حضور ﷺ کا علم چونکہ جامع تھا کہ آپ ﷺ کے ایک جملہ سے سینکڑوں باتیں نکلتی تھیں، تو اس جامعیت کا عکس امت پر بھی پڑا کہ کسی نے ایک کتاب لکھی پھر اس کی شرح لکھی گئی پھر شرح کی شرح اور پھر شرح کی شرح لکھی گئی ، تو معلوم ہوا کہ پیغمبر کے مزاج کا عکس امّت پر بھی پڑتا اور پہنچتا ہے۔

بنی اسرائیل کو جب فرعون سے نجات ملی اور دریا کے اس پار پہنچے تو دیکھا کہ وہاں گائے کی پرستش ہو رہی ہے تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ﴿ إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَة ﴾ (سورۂ اعراف، آیت نمبر: ۱۳۸) اور بھائی جب اِلٰہ کو بھی بنایا جائے تو پھر وہ معبود ہی کیا ہوا، تو یہ قوم صورت پرست ہے ہر چیز میں صورت پرستی، اسی لیے وہ غیب کی طرف کم متوجہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک مرتبہ کہا کہ ﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت نمبر: ۵۵) تو یہ قوم حس پرست اور صورت پرست ہے، اور نبیٔ کریم ﷺ کی امت حقیقت پرست ہے ، اور صورت اور حقیقت کہ درمیان مقابلہ ہو تو کامیابی حقیقت ہی کو ہوتی ہے اور آج کل صورت پرستوں کی یہ جو ظاہری کامیابی ہے وہ عارضی کامیابی

ہے، ورنہ حقیقت ودلائل کے اعتبار سے ان کے پاس کامیابی نہیں ہے۔تو اسلام اپنے اندر حقانیت لیے ہوئے ہے، مگر بدقسمتی اور افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کا ہی عمل اس پر پورا نہیں ہے۔آج مسلمانوں کا حال ویسا ہی ہے کہ'' مسلماں در گور، و مُسلمانی در کُتُب'' اور یہی ہمارے لیے سب سے بڑا المیہ ہے۔

مجلس نمبر (۸)

دین کو سمجھنے کیلئے دو چیزیں ضروری ہیں

مجلس نمبر (۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نسبتِ قوی کی مثال

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ نسبتِ قوی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی اسٹیشن پر کھڑا ہو اور بیوی بچّوں کے ساتھ ہو ایں قدر و آں قدر کے ساتھ اور سامان بھی ساتھ ہو اور ہجوم زیادہ ہو اور اوپر سے ٹرین ٹھہرتی کچھ دیر ہو، تو آپ تصور کیجئے اس وقت اس کی کیا کیفیت ہوگی کہ اِن سب باتوں کا خیال رکھنا ہے اُسے اس بیچ میں، تو وہ ایک کشمکش کی کیفیت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ اُس حالت میں بھی خدا سے غفلت نہ ہو یہ رسوخِ نسبت ہے۔ تو کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، کام پر، ہر وقت اُس کا دھیان ہو، پھر دیکھئے کیا لطف آتا ہے، اللہ تعالیٰ پر اعتماد آ گیا تو پھر جیتے جی جنت کا لطف ہے۔

انتخابِ شیخ میں غلطی نہ کریں

دیکھو بھائی! بیعت کے لیے کسی صحیح شخص کا انتخاب کرنا چاہیے اور صحیح شخص ہوگا تو وہ خالی وظیفے نہیں بتائے گا۔ وظیفے کا مطلب یہ کہ جو غیر صحیح ہوتا ہے وہ خالی وظیفے ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے، جو صحیح معنی میں شیخ ہوگا اس کی سب چیزوں پر نظر ہوگی کہ اس کے بیوی بچے ہیں یا نہیں، وہ ملازمت کرتا ہے یا نہیں، وہ سارے حالات کو دیکھے گا اس کی صحت کو بھی دیکھے گا، کیونکہ اگر اس کے مزاج میں گرمی زیادہ ہے اور اُسے زیادہ ذکر بتلا دیا تو وہ تو مارے گا لوگوں کو۔ تو وہ شیخ ساری چیزوں کو دیکھ کر پھر کوئی چیز تجویز کرے گا، تو یہ اللہ کا معاملہ ہے اس میں احتیاط سے کام لیں۔ ایسا نہیں کہ اپنی عورت جس باپو کے پاس لے چلے چل دئے، اس لیے اپنی بیوی کو، اپنے بھائیوں کو یہ حقیقتیں سمجھانے کی ضرورت ہے،

دین اتنا گیا گذرا تھوڑا ہی ہے کہ آپ ہر کس و نا کس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے، تو اس معاملہ میں وہ جو چکر ہے اس سے بچنے کی ضرورت ہے، اللہ پاک صحیح سمجھ دے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

اپنے کو مٹانے کی ضرورت ہے

اور بھائی اپنے کو مٹانے کی ضرورت ہے۔ ایک بزرگ نے نواب زادہ کو کچھ کہا تو وہ کہنے لگا آپ مجھے پہچانتے ہو؟ فرمایا ہاں! جانتا ہوں اول کی حالت تو آپ کی یہ ہے کہ ناپاک نطفہ تھے، آخری حالت یہ ہے سڑیل مردار ہو گے، اور درمیانی حالت یہ ہے کہ پیٹ میں ناپاکی بھرے پھرتے ہو۔ (تسہیل المواعظ ج۱،ص: ۶۴۹)

صدّیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر فرمایا کہ آدمی کے لیے تکبر بالکل مناسب نہیں ہے کہ وہ آدمی تکبر کیا کرے گا، جو روزانہ اپنے ہاتھ سے نجاست صاف کرتا ہو تو واقعی یہ بات ہے، لہٰذا اپنے کو مٹانے کی ضرورت ہے، اگر یہ ہو گیا تو پھر اللہ تعالیٰ ایسی شکل پیدا فرمائیں گے کہ کچھ نہ ہو کر بھی آپ سب کچھ ہیں اور اسی کا نام فقیری میں بادشاہی ہے، تو اللہ تعالیٰ کے آگے گڑگڑانے کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کی زندگی اصل میں باسی کڑی کی طرح ہو گئی ہے تو بے قراری اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے اس کی کوشش کریں۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے بارے میں حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو چھپائے رکھا ہے، یعنی اپنی روحانی کیفیت وحالات کو اگر وہ اُسے ظاہر کر دیں تو ہزاروں انسانوں کو جنگل میں دوڑا دیں اور اُن کے حواس گم کر دیں، ایسی کیفیت تھی اُن کی بالکل جلے بھنے ہوئے تھے۔

قربِ الٰہی کے لیے طریقۂ محمدی شرط ہے

قرآنِ کریم میں اولیاء اللہ کے بارے میں فرمایا کہ ﴿ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا يَحْزَنُوْنَ ○ ﴾ (سورۂ یونس، آیت نمبر: ٦٢) یہ تو ولایت کا اثر ہے اور ان کی صفت بتلائی کہ ﴿ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ ﴾ (سورۂ یونس، آیت نمبر: ٦٣) ایمان وتقوی، تو نسبت آپ کی بڑی قوی تھی اور یہ اسی وقت ہو سکے گا جب آدمی آپ ﷺ کے طریقے پر ہو، قرب اسی سے نصیب ہوگا، باقی آدمی اپنے طور پر جو مجاہدہ کرنا چاہے کرے، مگر اس سے قُربِ الٰہی نصیب نہیں ہوتا۔ خدا کے یہاں مقبولیت اسی میں منحصر ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کا اتباع ہو۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ....

مپندار سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزیر
ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(بہارِ بوستاں شرح بوستاں، ص: ٢٢)

تو آدمی اس کے بغیر منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

حضور ﷺ کے زمانے میں انسانیت کا روحانی جسم کامل ہو گیا

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیس بیس، پچیس پچیس، سال تک فلسفی ایک بات کو صحیح سمجھتا ہے اور پھر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ غلط بات ہے، اسی لیے آج ایک قانون ہے پھر کل نہیں ہے۔

البتہ قرآنِ کریم اور حدیث میں جو نص ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ نہایۃ المدۃ ہے، اُس کا معاملہ فلسفی جیسا نہیں ہے، اس کو آپ ایسے سمجھیں جیسے آپ کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس گئے، اس نے کہا کہ آپ کا معدہ خراب ہے اور اس نے آپ کو ایک دوا دی، کچھ اصلاح ہوئی اس سے، پھر دو تین دن بعد اس نے ایک اور دوا دی اس سے کچھ اور اصلاح ہوئی، پھر دو تین بعد اور ایک دوا دی اس سے اور اصلاح ہوئی۔ اب یہ جو دوا بدلتا جا رہا ہے یہ کوئی جہل نہیں ہے، بلکہ حکمت کی بات ہے کہ مریض کا حال چینج ہو رہا ہے، لہٰذا دوا بھی چینج ہو رہی ہے، اسی طرح قرآنِ کریم میں جو بعض آیات آئی ہیں کہ پہلے کوئی حکم تھا پھر وہ بدل گیا اور دوسرا حکم آیا، اس کی حیثیت یہ ہے کہ لوگوں کے حالات بدلتے رہیں، لہٰذا حکم بھی بدلتا رہا۔

اور دیکھئے احکام وہ بھیجیں حق تعالیٰ نے کہ جن کو انسان نبھا سکے اور انسانیت کے جسم پر فٹ ہونے والا لباس دیا، جیسے بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے لیے چھوٹا کرتا اور چھوٹا پاجامہ ہوتا ہے، پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کا لباس بھی بدلتا رہتا ہے، پھر ایک نکتہ پر آ کر اس کا لباس رک جاتا ہے، تو انسانوں کی جو صلاحیتیں تھیں اس پر جو شریعت کا لباس تھا وہ بھی اسی اعتبار سے بڑھتا گیا اور حضور ﷺ کے زمانے میں پہنچ کر انسانیت کا معنوی اور روحانی جسم کامل ہوگیا، تو شریعت کا جو روحانی کامل لباس ہے وہ اسے دیا گیا (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۴، ص: ۴۶) اب اس کے بدن کے بڑھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا کسی نئے قانون کے بننے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا، اس سے ایک بات اور بھی کھلی کے اس کا یہ مطلب نہیں کہ پچھلے نبیوں کو جو قانون دئے گئے تھے وہ غلط، بلکہ بچہ جب پیدا ہوا اس کے لیے اس وقت جو پوشاک تیار کی، کرتہ پاجامہ وغیرہ تو وہ کپڑا اس زمانے کے عین مناسب تھا، اس وقت اگر یہ لباس پہنا دیا جاتا تو چھپن (۵۶) مرتبہ اس کو لپیٹنا پڑتا اس میں یا اِس وقت وہ لباس پہنا دیا جائے تو گڑبڑ ہوجائے گی، لہٰذا اتنا ثابت ہوا

کہ جس زمانہ میں جو شریعت رہی وہ اس وقت برحق وہ بھی ثابت ، اس کے بعد وہ مناسب اس کے بعد وہ پھر وہ پھر وہ پھر فلاں فلاں اور پھر آخر میں نبی کریم ﷺ کی امت ۔
(فیضِ ابرار، ج ۳، ص:۱۸۴)

تو جب تک ادھر کی مراد معلوم نہ ہو اس کا قرب کیسے حاصل ہوگا تو قرآن وحدیث کا علم اصل ہے اور اُس کے مقابلے میں فلسفیوں کا حال یہ ہے کہ وہ چالیس چالیس پچاس پچاس سال تک ایک بات کو حق سمجھتے ہیں پھر کہتے ہیں غلط ۔ اصل میں بات یہ ہے کہ علمِ انسانی ایک حد پر جا کر رُک جاتا ہے اس کے بعد کچھ بھی نہیں ۔

قانون ساز اللہ تعالیٰ ہیں، علماء تو قانون داں ہیں

میرے پاس ایک پروفیسر صاحب آئے اور کہنے لگے کہ فلاں حکم ایسا کیوں ہے یہ ایسے نہیں ہونا چاہیے ، مولوی لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں اسے بدل دینا چاہیے ، تو میں نے ان سے کہا کہ دیکھو دو باتیں ہیں : ایک ہے قانون داں ہونا اور ایک ہے قانون ساز ہونا ۔ پھر میں نے کہا اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ ایک پولیس والا چوراہے پر کھڑا ہے اس نے دیکھا کہ ایک آدمی موٹر سائیکل پر ٹرپل سیٹ لے جا رہا ہے تو اس کو کہا ادھر آؤ اپنا نام لکھاؤ اس نے کہا کیوں ؟ کہا قاعدہ ہے کہ موٹر سائیکل ٹرپل سیٹ نہیں چلا سکتے ، اب وہ کہے کہ یہ قانون ایسا کیوں ہے اور یہ کیوں ہے اور وہ کیوں ہے؟ تو وہ پولیس والا کہے گا کہ آپ کو اس پر جو کچھ ڈسکس کرنا ہے وہ قانون بنانے والے جو پارلامینٹ میں بیٹھے ہیں ان سے جا کر کریں اور جو کچھ پوچھنا ہے ان سے پوچھئے وہ قانون بناتے ہیں وہ ان کا کام ہے ، تو وہ قانون ساز کہلائیں گے اور میں تو صرف قانون داں ہوں ، تو میں نے ان سے کہا کہ علماء جتنے ہیں وہ سب قانون داں ہیں اور قانون ساز اللہ میاں ہیں اور دنیا میں پیغمبر اس کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

اصل میں وہ آئے تھے میرا امتحان لینے کہ ذرا ان کو جانچیں کہ ملاؤں کو صرف اتنی خبر ہوتی ہے کہ کنویں میں چھپکلی گر جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا، تو میں نے ان سے کہا کہ آپ قانون داں سے قانون ساز کا کام لینا چاہتے ہیں تو وہ آپ کی اصولی غلطی ہے یا نہیں؟ وہ پروفیسر تھا اسے اپنے علم پر ناز تھا تو وہ کہنے لگا کہ ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے، تو میں نے ان سے کہا کہ اللہ میاں قانون ساز ہیں اور علماء قانون داں ہیں۔

عقل تو حواس کے تابع ہے

پھر میں نے کہا کہ دیکھئے! ایک ترازو پیتل کی چھوٹی سی ہوتی ہے اس پر سونا اور چاندی تلتا ہے، ایک اس سے بڑی ہے اس میں ایندھن اور سوختہ تلتا ہے اور ایک وہ ترازو ہوتا ہے کہ اس میں ہزاروں ٹن ریل کا ڈبہ تلتا ہے، تو میں نے کہا کہ کوئی آدمی سونا لے کر ریل کا ڈبہ تلنے والی ترازو والے کے پاس جائے اور کہے کہ مجھے اس میں سونا تولنا ہے تو کوئی کیا کہے گا، اسی طرح اس کی الٹی شکل ہو تو لوگ کہیں گے (خطبات حکیم الاسلام ج ۴، ص: ۵۶) کہ اس کی پاؤ لی کم ہے۔ میں نے کہا جب آپ یہ سمجھ گئے تو اب یہ بھی سمجھ لیں کہ عقلِ انسانی بھی محدود ہے جو حواس کی تنگنائیوں میں گم ہے وہ اس سے آگے نہیں جا سکتی اور اسے تم ترازو قرار دے رہے ہو اُس شریعت کی جس کا تحمل آسمان و زمین نہیں کر سکتے ہیں اور عقل تو تابع ہے حواس کے۔ وہ ہاتھی اور اندھوں کا قصہ مشہور ہے، اور عقل کا تو یہ حال ہے کہ بعض دفعہ جہاں آنکھ نہیں جاتی وہاں عقل نہیں جاتی اور جہاں کان نہیں سن پاتے وہاں عقل نہیں جاتی، تو عقل تو بے چاری حواس کی محتاج ہے ان کے ماتحت ہے۔

انسان کی عقل اور اس کی صفات محدود ہیں

اور پھر میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں

تو یہ بات غلط ہے کیونکہ آپ کی عقل محدود ہے۔ اور میں نے کہا دیکھو! یہ فاؤنٹن پین ہے اس کے وجود کا مطلب یہ ہے کہ یہ یہاں سے چل کر یہاں تک ہے اور آگے نہیں ہے، اور ادھر سے ادھر تک ہے آگے نہیں ہے، اور پھر ادھر سے ادھر تک ہے آگے نہیں ہے۔غرض یہ کہ یہ چھ طرف سے نہیں ہے اور بیچ میں ہے، اور میں نے کہا کہ اگر نہیں سمجھ میں آتا تو آپ کھڑے ہوجائیں میں آپ کو ثابت کر کے بتلاؤں کہ آپ پیر کے تلوے سے لے کر سر کے بال تک ہیں اس کے اوپر نہیں، اور سر سے پیر تک ہے اس سے نیچے نہیں، اور دائیں کاندھے سے بائیں کاندھے تک ہے پھر نہیں، اسی طرح اس کی الٹی شکل اور پیٹ سے پیٹھ تک ہے، اسی طرح اس کی الٹی شکل تو چھ طرف سے ہے پھر نہیں ہے۔تو غرض یہ کہ میں نے ان کو کہا کہ آپ بھی چھ طرف سے نہیں ہیں اور بیچ میں ہیں یہ آپ مانتے ہیں یا نہیں؟ پھر میں نے کہا آپ کا وجود ایسا ہے جس کو چھ طرف سے نہ ہونے نے گھیرا ہے اور آپ کا ہونا چھ طرف سے نہ ہونے کو مستلزم ہے۔

مسلم اور غیر مسلم کی سوچ کا فرق

میں نے کہا یہی وجہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایک آدمی سخت دھوپ کی حالت میں ایسی جگہ پہنچا جہاں درخت نہیں اور کوئی آڑ نہیں، بس صرف اس کا سایہ تھا وہ وہاں جا کر آتا ہے اور آکر لوگوں سے کہتا ہے کہ میں ایک ایسی جگہ گیا تھا جہاں میرے سایہ کے سوا کچھ نہیں تھا۔حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ سایہ جس جگہ نہیں تھا اتنی ہی جگہ نور نہیں تھا اور اس کے علاوہ باقی جگہ دھوپ ہی دھوپ تھی، مگر حضرت فرماتے ہیں کہ وہ ایسا اِس لیے کہہ رہا ہے کہ دھوپ کا وجود اتنا پھیلا ہوا تھا اتنا پھیلا ہوا تھا کہ اس کی وسعت کے سامنے اس کی نگاہ کام نہیں کرتی تھی، تو جو حقیقۃً وجود ہے اس کو وہ کہتا ہے نہیں ہے اور جو نہیں ہے اس کو کہتا ہے، ہے۔ کچھ پلے بھی پڑا کہ نہیں

آپ کو کہ وہ آدمی جس کا وجود نہیں ہے اس کو وہ کہتا ہے، ہے۔ اور جو ہے اس کو کہتا ہے نہیں ہے ۔ بس یہی فرق ہے مسلم اور غیر مسلم کی سوچ کا یہ جو آسمان وزمین اور جتنی کائنات ہے یہ واقعۃً کچھ نہیں ہے یہ تو غیر مسلم کی نگاہ کا قصور ہے کہ جو کچھ نہیں ہے اس کو وہ کہتا ہے کہ سب کچھ ہے اور جو سب کچھ ہے اس کو کہتا ہے کچھ نہیں ہے ۔ اور مؤمن کی نگاہ کی گہرائی یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے وہ کچھ نہیں ہے، اس کے سوا سب کچھ ہے ﴿ اللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (سورۂ نور، آیت نمبر: ۳۵) یہ ہے وہ چیز کہ...

کافر کی یہ پہچان کے آفاق میں وہ گم ہے
اور مؤمن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہے آفاق

انسان کی ساری صفتیں لمیٹیڈ ہے

تو میں نے کہا کہ خود انسان اور انسان کا علم ایک نکتہ پر جا کر رُک جاتا ہے، پھر میں نے کہا کہ آپ نے جو ڈگری حاصل کی ہے اس میں ایک حد تک آپ کا علم چلتا ہے پھر رُک جاتا ہے، اسی طرح آپ کی نگاہ ایک حد تک دیکھتی ہے پھر نہیں دیکھتی، اسی طرح آپ کسی وزنی چیز کو ایک حد تک اٹھائیں گے پھر نہیں اُٹھا سکتے، تو میں نے کہا آپ کی ساری صفتیں ایک لمیٹ تک کام کرتی ہے اُس سے آگے پھر لا جواب ۔تو آپ کا وجود بھی محدود، اور آپ کی صفتِ علم بھی محدود، تو میں نے کہا پھر آپ اپنی محدود عقل سے اور محدود صفت سے اُس شریعت کو پرکھنا چاہتے ہیں اور اپنی عقل کو اُس کے لیے میزان قرار دینا چاہتے ہیں جس کا تحمل آسمان وزمین نہیں کر سکے ۔ میں نے کہا یہ کوئی دانشمندی کی بات ہے تو وہ میرا منھ دیکھنے لگا۔ (فیضِ ابرار)

علم تو وہ ہے جو ہمارے پاس ہے

یہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا فلسفہ ہے اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں انگریزی زبان نہیں جانتا، ورنہ یورپ کو بتلاتا کہ علم وہ نہیں جو آپ کے پاس ہے، بلکہ علم وہ ہے جو ہمارے پاس ہے، اگرچہ مادی اور سائنسی تجربے ان کے پاس ضرور ہے، مگر معرفت اور حقائق کی پہچان جو اُن حضرات کو تھی ان کا سوواں حصہ بھی اِن کے پاس نہیں ہے۔ ہاں! اِنہوں نے ضرور مادی کوششیں کیں اور اُس میں کچھ کامیابی حاصل کیں، اگر چہ اُس کے بہت سے فارمولے اُنہوں نے ہم ہی سے لیے ہیں۔

پہلے اپنی عقل کی اصلاح کریں

تو میں نے ان سے کہا کہ جو یہ کہتا ہے کہ اسلام کا فلاں احکام اور فلاں مسئلہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو وہ پہلے اپنی عقل کی اصلاح کریں، کیونکہ اگر عقل بنیاد ہے تو عقل والوں نے دنیا میں ہزاروں ایسی چیزیں تیار کی ہیں کہ وہ کل صحیح تھیں آج غلط ہے۔ برسوں سے یہ کہتے تھے کہ آسمان گردش میں ہے اور اب یہ کہتے ہیں کہ زمین گردش میں ہے، تو ہر روز ایک نیا تجربہ ہے۔

تو کلی اور اصولی بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی عقل کو بہت سی جگہ چھوڑنا پڑے گا۔ ہاں! اگر عقل عقلِ سلیم ہے تو عقلِ سلیم اور نقلِ صحیح میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، اگر عقلِ سلیم ہے تو وہ شریعت کے ہر ہر حکم کو مانے گی اور اگر عقل میں کجی ہے تو علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ بہت بڑے عالم گذرے ہیں اور وہ ایسے تھے کہ پچھلی صدیوں میں جتنے بڑے عالم گذرے ہیں ان کی یادگار تھے۔

مستشرقین نے امام غزالی رحمہ اللہ کے متعلق کہا ہے کہ وہ اسلام کے حق ہونے کی

ایک دلیل ہے۔ اور حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میرے نزدیک علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ اسلام کے حق ہونے کی ایک دلیل ہے۔ (تصویر انور، ص: ۲۰)

اگر اسلام میں تھوڑی سی بھی کمی ہوتی تو شاہ صاحب رحمہ اللہ اسلام قبول نہ کرتے۔ بتائیے! کتنی بڑی شخصیت ہوگی تو شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میری اتنی زندگی گذر گئی آج تک کسی فاجر وفاسق شخص کو دین کے باب میں درست رائے والا نہیں پایا اصولی طور پر تو ہے، لیکن جہاں ریسرچ اور تکرار اور بحث ہوگی وہاں پر کوئی جگہ ایسی ضرور آئے گی کہ ٹکراؤ ہو جائے گا۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ گناہ کرنے سے عقل خراب ہو جاتی ہے چونکہ عقل میں ایک نور ہوتا ہے اور گناہ کرنے سے وہ چلا جاتا ہے (تسہیل المواعظ ج۱، ص: ۵۰۰) اس لیے وہ جو چیز ہے اس طرف کی وہ اس میں باقی نہیں رہتی۔ ذہانت تو ہے، مگر وہ جسے عقلِ معاد کہتے ہیں وہ نہیں چلتی، اسی لیے دنیا میں بڑے بڑے عقلمند ہیں، مگر جہاں معاملہ دین کا آجاتا ہے وہاں اُن کی عقل کام نہیں کرتی، تو میں نے جب ان سے یہ بات کہی تو اسے ماننا پڑا، تو عقل سے قرب نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم میں وہ حکمتیں ہیں کہ اس کے سامنے سارے حکماء، سارے فلاسفہ اور ان کے سارے تجربے اور ان کی ہوشمندی اور دانشمندی وہ سب مندی ہے، تو اپنی عقل سے قُربِ اِلٰہی کا راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے اتباعِ سنّت ضروری ہے۔

اصول کا حصول ضروری ہے

لہٰذا کلی جواب یہ ہے کہ جتنے اعتراضات ہیں اُس کے لیے پہلے اصول سمجھ لیں، آدمی جب اصول سمجھ لیتا ہے تو سارے مسئلے ختم ہو جاتے ہیں، مثلاً میاں بیوی ہے ان میں میاں کو بیوی سے اور بیوی کو میاں سے شکایت رہتی ہے اور دونوں صبح سے شام تک ایک دوسرے سے یوں کہتے رہتے ہیں کہ تو نے یہ کیا اور وہ کیا، تو وہ جو اشکال ہے میاں

کا بیوی پر اور بیوی کا میاں پر ان سارے اشکالات کو حل کرنے کے لیے ایک ایک جزئی کو لے کر بیٹھنا غلط ہے ۔اصل یہ دیکھنا ہے کہ اس کی مین سوچ کیا ہے ، اگر یہ حل ہو گیا تو سارا مسئلہ حل ہے، مثلاً یہ کہ مناسبت نہیں ہے اس لیے یہ ٹکراؤ ہے تو اگر اس کا کوئی حل نکل گیا تو بات ختم ہے سارے مسئلے حل جائیں گے ، جیسے درخت ہے آپ کے یہاں اس کے پتے خشک ہیں اس کی ڈالی خشک ہے ، اب ان میں ایک ایک پتے اور ڈالی کو آپ تازہ کب کریں گے ، اس کا آسان علاج یہ ہے کہ آپ اُس کی جڑ میں پانی ڈال دیجئے اگر جڑ میں پانی پہنچ گیا تو اس کے تُھرو سارے درخت میں پانی پہنچ جائے گا ، یہ ایک موٹی سی بات ہے ۔تو معلوم ہوا کہ مسائل کے حل کے لیے بنیادی چیز دیکھی جاتی ہے تو یہ جو اشکالات ہیں کہ تراویح کی آٹھ رکعت ہیں یا بیس رکعات ، یا خطبۂ جمعہ اردو میں ہونا چاہیے یا عربی میں ، یہ اور اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں اور جتنے جھگڑے ہیں، ہم سب سے پہلے یہ کہتے ہیں کہ اس کے حل کے لیے سب سے پہلے اصول سمجھ لیں اور صحیح فہم پیدا کیجئے تو سارے اشکالات ختم ہو جائیں گے، ورنہ تو روز کے نئے نئے اشکالات ہیں کہ یہ کیوں اور وہ کیوں ؟

جیسا سوال ویسا ہی جواب

حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے ایک آدمی نے کہا کہ حضرت یہ مسئلہ ایسا کیوں ہے ؟ تو حضرت رحمہ اللہ نے اس سے فرمایا کہ ناک تمہارے چہرے پر آگے کی طرف ہی کیوں ہے؟ پیچھے کی طرف کیوں نہیں؟ وہ بھی ہوشیار تھا اس نے کہا کہ پیچھے ہوتی تو بری معلوم ہوتی ۔حضرت نے فرمایا اگر صرف تمہاری ہوتی تو بری معلوم ہوتی سب کی ہوتی تب تو بری معلوم نہیں ہوتی (ملفوظات حکیم الامت، حصہ نہم، ص: ۳۹۰) اب وہ خاموش ۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی ذکاوت کا کیا پوچھنا کہ...

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں لیکن
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز ونزاکت والے

نقصان نہیں عدمِ نفع ہے

ایک دفعہ ایک بیرسٹر آئے حضرت کے پاس اور وقف کے معاملے میں بحث کی حضرت سے ، وہ اور بھی بہت سی جگہ بحث کر کے آئے تھے ، وقف کا کوئی مسئلہ تھا ، وہ کہنے لگے اس میں فقیروں اور غریبوں کا نقصان ہے ،تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نقصان نہیں عدمِ نفع ہے، اس نے کہا کیا مطلب؟ تو حضرت نے فرمایا کہ تم نقصان اور عدمِ نفع کا فرق نہیں جانتے؟ دیکھو! ایک آدمی نے سو روپے کی کوئی چیز خریدی اب اس کے بعد وہ اس کو سو روپے میں ہی بیچتا ہے تو نفع تو نہیں ہے ،مگر نقصان بھی نہیں ہے تو اس کو عدمِ نفع کہیں گے۔ نقصان تو یہ کہ دس سے کم میں جائے ۔ اب جب حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ کہا کہ نقصان نہیں ہے عدمِ نفع ہے تو وہ مبہوت ہو گیا کہ اسے اس کا فرق ہی معلوم نہیں تھا تو وہ خاموش ہو گیا اور آگے کی اس کی ساری بنیادیں ہی منہدم ہو گئیں ۔

(انفاسِ عیسی ،ص:۵۷۹)

چراغ جلا دو اندھیرا دور ہو جائے گا

تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ سب سے پہلی چیز لوگ جو اعتراض کرتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ ایک ایک سوراخ تم کب بند کرو گے ۔ایک آدمی کے گھر میں بہت سارے سوراخ تھے وہ اس کو ایک ایک کپڑا لے کر بند کر رہا تھا تو کسی نے کہا کہ یہ سب کب بند کرو گے ایک بڑا صافہ ہی اس پر رکھ دو تو سارے سوراخ بند ہو جائیں گے ۔اسی طرح

ایک بڑے میاں کے یہاں گھر میں اندھیرا تھا تو کیڑے مکوڑے بہت پریشان کرتے تھے، کسی نے کہا کہ چراغ جلادو اندھیرا دور ہوجائے گا تو سارے کیڑے مکوڑے خود بخود بھاگ جائیں گے، تو اس کو بھی آپ گھر سمجھے اور اس میں علم وحکمت کا چراغ جلادیں تو وہ اعتراض کے جو کیڑے مکوڑے ہیں وہ سب ختم ہوجائیں گے، اب چراغ جلنے کے بعد زیادہ سے زیادہ پروانہ آئے گا کہ جس کو جان کی پرواہ نہیں ہے۔

بعض شاعر نے اس کو حاسد قرار دیا ہے کہ جیسے حاسد جو ہے پہلے خود جلتا ہے اسی طرح پروانہ بھی چراغ کو گل کرنا چاہتا ہے اور پہلے خود جلتا ہے تو مطلب یہ کہ اب زیادہ سے زیادہ وساوس ہوں گے، وہ تو پھر خود ہی ختم ہوجائیں گے۔

دین کو سمجھنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں

لوگ کیا کرتے ہیں ایک اشکال اس کا جواب، پھر کوئی اشکال اور اس کا جواب، تو میں کہتا ہوں کہ یہ کب تک آپ کریں گے اس کی مثال ایسی ہے جیسے آدمی کے بدن میں کمزوری ہے، کبھی آنکھ دکھتی ہے، کبھی کان دکھتا ہے، کبھی ہاتھ دکھتے ہیں، کبھی پیر دکھتے ہیں اور فلاں فلاں ہوتا ہے، یہ سب کیوں ہورہا ہے، اس کی کی وجہ کمزوری ہے، تو چاہیے کہ وہ کوئی ایسا ٹانک لے کہ ساری کمزروی ختم ہوجائے تو بات ختم، کہاں ایک ایک عضو پر آپ دوا لگاتے رہیں گے۔ تو دین کو سمجھنے کے لیے بھی اصولی چیز سمجھنے کی ضرورت ہے اور ساتھ میں صحبتِ صالحین، کیونکہ صحبت سے بہت سے حقائق کھل جاتے ہیں۔

جیسا شعور ویسا درجہ

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک فیکٹری تھی اس میں مشین لگانی تھی، اب وہاں کے جو میکینک تھے وہ ہلکا پھلکا کچھ جانتے تھے انہوں نے بہت کوشش کی، مگر بات نہیں بنی تو اس کا جو مالک

تھا اس نے باہر سے اس کے دو ماہرین کو بلایا، انہوں نے آ کر مشین کو دیکھا اور منٹوں میں درست کر دیا، فیکٹری مالک نے ان کو کئی ہزار روپیے دئے، تو وہ دوسرے میکینک کہنے لگے کہ ہم نے اتنی زیادہ محنت کی اور ہمیں تھوڑا سا معاوضہ دیا گیا اور ان کو اتنا زیادہ، تو وہ مل مالک کہنے لگا ان کو بھی جو کچھ دیا گیا ہے ان کی محنت پر ہی دیا گیا ہے، تو یہ جو فرق ہوا اس کی وجہ مہارت ہے، اسی لیے آپ دیکھیں جتنی پوسٹ اونچی ہوتی ہے اتنا ہی شعور بھی اونچا ہوتا ہے، اور پھر اس کے مناسب ہی اسے معاوضہ بھی دیا جاتا ہے، تو معلوم ہوا کہ وہ فوقانی چیز ہے، ٹھیک اسی طریقہ سے دینی شعور کی بات ہے جس درجہ شعور بڑھتا جائے گا اس کی حیثیت بھی بڑھتی جائے گی اور بعض دفعہ اس کا ایک جملہ سارے اشکالات کو دور کر دے گا۔

آج کی سب سے بڑی مصیبت

تو جب دنیوی لائن میں آدمی کسی ماہر کے پاس جا کر ٹرین ہونا چاہتا ہے تو دین اتنا سستا تھوڑی ہے، آج مصیبت کیا ہوگئی کہ ہر آدمی دین پر ریسرچ کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اسلامی حکومت نہیں ہے، اگر وہ ہوتی تو ان پر ہنٹر پڑتے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوتے تو تو واقع میں ہنٹر پڑتے، کیونکہ آج دین کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے، اسی لیے جس کے جو جی میں آتا ہے لکھتا ہے اور لوگ بڑے مزے سے کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ میرے خیال میں ایسا ہے، بھائی تم کون سے محقق آئے؟ تم نے کہاں اس میں عمر کھپائی تم نے تو اپنی ساری عمر خرافات میں کھپائی اور آخر میں جب کسی کام کے نہیں رہے تو دین پر ریسرچ کرنے بیٹھ گئے۔ دنیا کا تو یہ حال ہے کہ تمہیں جس لائن کا علم نہ ہو وہاں تم ابتدائی ریسرچ نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کے ماہرین آپ سے پوچھیں گے کہ یہ فن تم نے سیکھا ہے؟ تو جناب کہیں کہ سیکھتا بھی جاؤں گا اور سکھاتا بھی تو اس کی جو گت بنے گی وہ ظاہر ہے، مثلاً

کوئی آدمی دوا خانہ میں پہنچ جائے اور کہنے لگے کہ میں مریض کا علاج کروں گا اور سیکھا کچھ ہے نہیں تو اس کی کیا گت بنے گی وہ ظاہر ہے۔

ایک عورت کی عجیب ذکاوت

ڈاکٹری پر سے ابن جوزی رحمہ اللہ کی ایک بات یاد آئی ذکاوت کی بات ہے ایک عورت تھی وہ طب میں بڑی ماہر تھی اس کی آزمائش کے لیے چند لوگ اس کے پاس گئے اور جانے سے پہلے یہ کیا کہ ایک شخص کی پنڈلی میں زخم کر دیا اور پھر ایک لکڑی سے اس کو کھرچا اور پھر اس کے پاس علاج کے لیے صبح کے وقت پہنچے وہ ایسی ماہر تھی کہ اس نے زخم کو دیکھ کر کہا کہ اس زخم کو جس لکڑی سے کھرچا گیا ہے اس پر سانپ کا زہر پڑا تھا، سُن لو! سورج نکلنے کے بعد اس کا انتقال ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا، بڑی ذکاوت کی بات ہے۔

ذکاوت کا ایک اور واقعہ

اسی طرح ابن جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص کی لڑکی تھی اس کی شادی ہوئی، رخصتی سے پہلے وہ بیمار ہوگئی تو ایک عامل کو بلایا گیا، انہوں نے اس کو دیکھا اور پھر اس لڑکی سے پوچھا کہ تم صحیح صحیح بات بتاؤ تم اپنے شوہر کے یہاں جانا کیوں نہیں چاہتی؟ صحیح بات بتاؤ تمہارا علاج ہو جائے گا، اس نے کہا میرا ایک آدمی سے تعلق ہے اور میں نے اس کے ساتھ ہم بستری کی ہے جس کی وجہ سے میرا پردۂ بکارت پھٹ چکا ہے، یعنی میں محفوظ نہیں ہوں۔ کہا یہ بات ہے میں ابھی اس کو حل کرتا ہوں عامل نے اس کے باپ کو سب کچھ سمجھا دیا اور باپ کو کہا کہ میں دکھاوے کے لیے کچھ عمل کروں گا اور لڑکے والے کو کہا کہ اس کو جن لگا ہے اس کو نکالنا پڑے گا، مگر جن نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ جہاں سے نکلے گا اس لڑکی کا وہ عضو بے کار ہو جائے گا، مثلاً کان سے نکلے گا تو کان بہرا ہو

جائے گا اور آنکھ سے نکلے گا تو بینائی ختم ، اسی طرح اور چیزوں کا نام لیا اور کہا کہ اگر اس کی شرمگاہ سے نکلا تو اس کا پردۂ بکارت زائل ہوجائے گا، یعنی وہ باکرہ نہیں رہے گی ،تو شوہر نے کہا کہ یہی جگہ ٹھیک ہے ، کیونکہ وہ تو ظاہر ہونے والی نہیں ہے تو شوہر نے کہا کہ اس کو شرمگاہ سے نکال دے تو اس نے خالی خالی منتر پڑھا اور معاملہ نمٹا دیا واقعی بڑی ذکاوت کی بات ہے۔

خلاصۂ گفتگو

توخیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اصول سمجھنے سے سب اشکالات دور ہوجاتے ہیں ، آج مصیبت یہ ہے کہ دین کی سمجھ نہیں ہوتی اور جب سمجھ نہیں ہے تو اس کی وجہ سے اب ایک ایک چیز میں لوگ اٹکتے ہیں کہ یہ اشکال ہے اب اس کا جواب دو، پھر اور کوئی اشکال اس کا جواب دو ، یہ سب کب تک ہوگا تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ دین کی سمجھ پیدا کی جائے اصولی کتابیں دیکھیں بزرگوں کی صحبت اختیار کریں اور طلب ہو تو یہ سب ہوجاتا ہے ۔اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔آمین

مجلس نمبر (۹)

تین چیزیں مفید مع الخطر ہیں

مجلس نمبر (۹)

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

تین چیزیں مفید مع الخطر ہیں

ایک ہے تصوّرِ شیخ اور ایک ہے عشقِ مجازی اور ایک ہے سماع ؛ یہ تین چیزیں مفید مع الخطر ہیں۔

پہلے تصورِ شیخ کی حقیقت سمجھ لیں یہ جو سلسلہ ہے تصوف وسلوک کا ، بعض حضرات اس میں غلو کرتے ہیں اور حدود کی رعایت نہیں کرتے ، اور بعض حضرات انکار سے کام لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ سب ایسی ہی باتیں ہیں، تو اس کو سمجھنے کی ضرورت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا طریقہ اتباعِ شریعت ہے

درحقیقت اس سے جو مقصود ہے وہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور قرب اور یہ نصیب ہوتا ہے اتباعِ شریعت سے ، یہ گویا اصول ہے ۔ شریعتِ مطہرہ کی جتنی پابندی ہوگی اسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوگا اور جتنی نافرمانی ہوگی اتنا ہی بُعد ہوگا ، تو اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کا طریقہ اتباعِ شریعت ہے۔

الرفیق قبل الطریق

اور شیخ کو جو تجویز کیا جاتا ہے وہ اس لیے ہے کہ وہ اِس راستہ کے حق میں معین ہے مددگار ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آدمی جو بھی راستہ طے کرتا ہے تو اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے رفیقِ سفر کی " الرفیق قبل الطریق " کہ راستہ سے پہلے ساتھی ڈھونڈ لوں اور خدائی راستہ طے کرنے میں دشواریاں بھی پیش آتی ہیں ۔ اس میں دو قسم کی دشواریاں بڑی

دشواریاں ہیں: ایک شیطانی چالیں اور دوسرا نفسانی قید، یعنی نفس کی چالیں، ان دونوں کی طرف سے جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کے سمجھنے میں اور ان سے بچنے کے لیے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ ان کی طرف سے جو رکاوٹیں آئیں ان کے لیے وہ مناسب تدبیر کریں۔

اسی طرح ذکر کا معاملہ ہے اور ذکر بھی کتنا کریں وہ شیخ تجویز کرے گا، ورنہ زیادہ مقدار کی وجہ سے ہوسکتا ہے جنون کا غلبہ ہو اور وہ اول فول بکنا شروع کرے، یا یہ کہ بہت کم مقدار ہے تو اس میں اضافہ، اسی طرح بعض کے لیے خلوت اور بعض کے لیے جلوت مناسب ہے اس کا انتخاب، اسی طرح کسی کے لیے تلاوت مناسب ہے کسی کے لیے ذکر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو الگ الگ استعداد دی ہے، اسی لیے شیخ الہند رحمہ اللہ نے مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ سے یہ بات کہی تھی کہ آپ کے لیے حجرہ نہیں ہے، آپ کے لیے سیاست ہے، تو کسی کے لیے یہ مناسب کسی کے لیے وہ مناسب۔

شیخ مقصود نہیں معین ہے

خیر! تو شیخ کی جو ضرورت ہے وہ معاونت کے لیے ہے وہ مقصود نہیں ہے کہ آدمی اس کو واجب سمجھے گو سنتِ مستحبّہ ہے، یہی تحقیق ہے محققین کی اب اس سے عقیدت اور محبت اس لیے ضروری ہے کہ شیخ سے جب محبت ہوتی ہے تو اس کا اتباع سہل ہوجاتا ہے، کیونکہ آدمی جس سے محبت رکھتا ہے اس کی مانتا ہے اور جتنی مناسبت اور محبت ہوگی اتنا ہی وہ اس کا رنگ اختیار کرے گا اور اس طرح وہ ذریعہ بن جائے گا شریعت کی اتباع کرانے کا اور نتیجۃً آپ ﷺ سے محبت پیدا ہوگی، تو شیخ ذریعہ بنے گا آپ ﷺ کی معرفت ومحبت کا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات خدا سے تعلق کا ذریعہ ہے، تو شیخ اس میں اعانت کا ذریعہ ہے، اس سے سہولت ہو جاتی ہے مدد مل جاتی ہے، اور اگر کسی کی استعداد قوی ہے اور

بیعت نہیں ہوتا تب بھی کمال نصیب ہوسکتا ہے وہ اس پر موقوف علیہ نہیں ، البتہ تربیت ضروری ہے سنت اللہ یہی ہے ، اب آدمی جس سے بیعت ہوتا ہے تو بیعت کی بھی کچھ شرطیں ہیں ، مگر وہ ایک مستقل موضوع ہے۔

مجھے اس سے شرک کی بو آتی ہے

اب جب شیخ سے بیعت ہوگا تو ظاہر ہے شیخ سے محبت بھی ہوگی تو بعض طریق میں شیخ کا تصور ہوتا ہے۔

سید احمد بریلوی رحمہ اللہ شاہ عبد العزیز دہلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بیعت ہوئے ان کے مرید ہوئے ، تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان کو مراقبۂ تصورِ شیخ بتلایا تو سید صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مجھے شرک کی بو آتی ہے تو سید صاحب بھی بڑے آدمی تھے اور شاہ صاحب کی بھی بڑی نظر تھی تو فرمایا ٹھیک ہے ہم تم کو دوسرے راستہ سے لے چلیں گے (انفاسِ عیسی ، حکایاتِ اولیاء ، ص: ۹۷) یہ نہیں کہ ان پر گرانی ظاہر کی ، چونکہ وہاں مقصود دکانداری تو تھی نہیں۔

حکیم الامت رحمہ اللہ کی غیرت

اور حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ مجھ کو براہِ راست بالارادہ مخلوق کی طرف نظر کرنے سے غیرت آتی ہے (انفاسِ عیسی ص: ۴۴۸) وہ تو اس پر انہوں نے فرمایا کہ کسی پر بالارادہ قلب سے متوجہ ہو شیخ اور یہاں مرید کہ تصورِ شیخ کی بات تھی۔

تصورِ شیخ اس دور میں مفید مع الخطر ہے

تو ایک شکل یہ ہے کہ قصد کے ساتھ مرید شیخ کا تصور باندھے۔ کچھ حضرات پہلے زمانے میں ایسے گذرے ہیں جنہوں نے بتایا کہ مرید اپنے شیخ کا تصور رکھے کہ اس سے

شیخ کی محبت بڑھے گی اور وہ ذریعہ بن جائے گا اتباع کا، مگر مفید ہونے کے ساتھ خطرے کی شکل اس میں یہ ہے کہ کہیں آدمی اسی کو مقصود نہ بنالیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی میں الجھا رہ جائے، جیسے کوئی شخص ائیر پورٹ پر پہنچے اور اسی کو دیکھتا رہے اور ائیر پورٹ ہی پر رہے تو اگر وہ اسی میں الجھ کر رہ گیا تو منزل تک رسائی نہیں ہوگی، اسی لیے زیادہ تحقیقی اور پسندیدہ بات یہی ہے کہ بالقصد اس میں نہ لگے، اگر دھیان آجائے تو اس کو اپنی سعادت سمجھے (معارفِ بہلوی) اور یہ بھی طے ہے کہ جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کا خیال آتا ہی ہے، تو خیال کا آجانا اور چیز ہے اور بالقصد خیال کا جمانا اور چیز ہے۔ تو بعضوں نے بالقصد تصور کی اجازت دی ہے، مگر زیادہ تحقیقی بات وہی ہے جو میں نے اوپر ذکر کی۔

اور خصوصاً اس دور میں جبکہ زیادہ بصیرت نہیں ہے تو صوفیاء لکھتے ہیں کہ اس میں فائدہ بھی ہے، مگر اس کے ساتھ خطرہ بھی ہے کہ وہ غیر مقصود کو کہیں مقصود نہ سمجھ لے اور اسی میں اٹک کر نہ رہ جائے۔

محبت کے آخری درجہ کا نام عشق ہے

یہی حال عشقِ مجازی کا ہے، ایک تو ہے عشقِ حقیقی جو ہوتا ہے حق تعالیٰ سے اور ایک ہے عشقِ مجازی جو مخلوق سے ہوتا ہے، اور عشق کہتے ہیں محبت کے آخری درجہ کو۔

امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کی ایک کتاب برسوں پہلے نظر سے گزری تھی اس میں وہ لکھتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ پہلے آدمی کو کسی شئی کی طرف میلان ہوتا ہے، اور میلان کے بعد رجحان ہوتا ہے، اور رجحان کے بعد دلچسپی ہوتی ہے، دلچسپی کے بعد محبت ہوتی ہے، اور محبت کے بعد عشق ہوتا ہے، اور عشق کے بعد جنون ہوتا ہے اور جنون کے بعد فنون فنا کی شکل ہے، تو عشق جب جنوں کا درجہ اختیار کرلے تو پھر آدمی سے عجیب عجیب باتیں ظاہر ہوتی ہیں، اسی لیے قرآنِ کریم میں آپ کو

کہیں ''عشق'' کا لفظ نہیں ملے گا لفظِ محبت تو ملے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کہتے ہیں اِفراطِ محبت کو حد سے زائد، لمیٹ سے باہر محبت کرنے کو اور یہ چیز بندوں کی طرف سے حق تعالیٰ کے حق میں دشوار ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے جتنی بھی محبت ہو وہ کم ہی ہے، اسی لیے " والذین اٰمنوا عشق حباً للّٰہ " کی بجائے فرمایا﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَشَدُّ حُباً لِّلّٰهِ ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت: نمبر ۱۶۵) تو اب یہ کیفیت ہے کہ قلب اس کا مکلّف ہے کہ حق تعالیٰ سے محبت ہو، پھر محبت کی بڑی تفصیلات ہیں ایک تو عقلی ہوتی ہے اور ایک طبعی ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ کی محبت اصل محبت ہے

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک مراد لذاتہ ہوتی ہے اور ایک مراد لغیرہٖ ہوتی ہے، مثلاً آپ بیمار ہیں اور کڑوی دوا پی رہے ہیں یا اپنے پھوڑے کا آپریشن کروا رہے ہیں، تو کڑوی دوا کی تکلیف اور آپریشن کی تکلیف یہ مراد لغیرہٖ ہے لذاتہ نہیں ہے کہ مقصود آپ کا آپریشن اور کڑوی دوا پینا نہیں ہے، بلکہ آپریشن اور کڑوی دوا سے مقصود شفا ہے، تو آپریشن اور کڑوی دوا یہ مقصود لغیرہٖ ہے، اور شفا اور صحت کا حصول یہ مقصود لذاتہٖ ہے اور حقیقت یہی ہے تو حق تعالیٰ کی محبت یہ تو اصل محبت ہے۔

شیخ سے محبت اس لیے ضروری ہے تا کہ اصلاح کا کام آسان ہو جائے

اور یہ جو دوسری محبتیں ہیں یہ مجازی کہلاتی ہیں تو عشقِ مجازی اگر کسی ایسے سے ہو جہاں عشق کی گنجائش ہی نہیں ہے تو تو سرے سے حرام ہے، جیسے مثال کے طور پر آپ نے کسی اجنبیہ سے عشق کرلیا تو یہ سرے سے ہی غلط ہے، اس سے تو محبت ابتداءً ہی جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے محبت بڑھائی تو یہ عشقِ مجازی ہے اور اس

کی گنجائش ہے، مگر یہ مفید مع الخطر ہے۔ مفید مع الخطر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس میں رُکا رہ گیا تو اس صورت میں آگے نہیں جا سکے گا بایں معنی مفید مع الخطر ہے، مثال اس کی وہ ہے جو میں نے پرسوں دی تھی۔

تو شیخ سے عقیدت اور محبت اس لیے ضروری ہے تا کہ شیخ کا کام آسان ہو جائے، وہ کیسے؟ جیسے کمرے میں کچرا پڑا ہے اب آدمی ایک ایک تنکا لے جا کر باہر ڈالے تو وہ دردِ سر ہی ہے، اس کے بجائے اس کو ایک کونے میں کر دیا تو اب اس کو ہٹانا سہل ہے۔

(تسہیل المواعظ، ص:۲۲۶)

تو جس شخص کو کسی کے ساتھ محبت ہے تو اس کے تمام خیالات تمام فکریں وہ ایک نکتہ اور ایک مرکز اور ایک ہی جگہ پر ہے، تو اب شیخ کے لیے آسان ہے کہ وہاں سے ہٹایا تو فوراً جو ہے اس طرف متوجہ ہو جائے گا، تو گویا یہ سارا پھیلا ہوا جھمیلا اور یہ لفڑے وہ سب ایک ہی مقام پر ہے، لہٰذا کام سہل ہے۔

تو شیخ سے اگر عشقِ مجازی ہوگی تو عشقِ حقیقی کی طرف اس کو پھیرنا آسان ہو جائے گا، مگر اس صورت میں خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ اتنی پختہ ہوگئی کہ ہٹی ہی نہیں تو آ بنے گی اور اگر ہٹ گئی تو پھر خوب بنے گی۔

وہ میرے بھانجے ہیں چھوٹے سے ایک دفعہ میں اس کو جلسہ میں لے گیا تو اس نے ایک رکوع پڑھا اور وہ جب کبھی جلسہ میں تلاوتِ قرآن کرتا تو ﴿ يٰبَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ إلخ ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت نمبر: ۴۰) وہ چھوٹے سے تھے میں نے کہا کہ دیکھو نیچے دیکھ کر پڑھنا، ورنہ اگر مجمع پہ تمہاری نظر پڑی تو بجائے " يٰبني " کے تمہاری آ بنی۔

تو غرض یہ کہ یہ شکل ہے کہ جہاں اس میں فائدہ ہے وہاں یہ خطرہ بھی ہے تو تصورِ شیخ میں تحقیق یہی ہے کہ اگر دھیان آ جائے تب تو پسندیدہ ہے اور اگر اسی میں الجھا رہے تب تو خطرہ ہے۔

ہاں ! اگر کوئی محقق شیخ ہو اور وہ بطورِ علاج کسی کو یہ تجویز کرے تو الگ بات ہے، اور ویسے محبت ہو تو آدمی کو شیخ کا خیال آتا ہی ہے، ایک نہیں سینکڑوں دفعہ خیال آتا ہے، تو یہ ہے کہ عشقِ مجازی میں بھی خطرہ بہت ہے۔

بیوی سے محبت تقویٰ میں اضافہ کا ذریعہ ہے

اب ایک دوسرا پہلو بھی سن لو حکیم الامت رحمہ اللہ کے نام ایک خط آیا کہ مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے، جی چاہتا ہے کہ اسی کو دیکھا کروں تو یہ کیسا ہے؟ تو اب آپ دیکھئے! حضرت نے جواب لکھا کہ سبحان اللہ، ماشاء اللہ، مبارک ہو، تقویٰ میں اضافہ ہو رہا ہے (انفاسِ عیسی ص: ۱۷۵) وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ جتنا اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوگا اتنا ہی غیر سے لا پرواہ ہوجائے گا، باقی یہ ہمارے سامنے واقعات ہیں کہ بعضوں کو اپنی بیوی سے لگاؤ ہی نہیں ہے، کیونکہ ادھر اُدھر لگاؤ ہوتا ہے تو بیوی سے لگاؤ نہیں ہوتا، تو یہ متقی ہونے کی علامت ہے کہ جتنا زیادہ اس سے لگاؤ ہے اتنا ہی غیر کی طرف توجہ نہیں ہوگی اس اعتبار سے وہ مفید ہے۔

خیر! جس پر ہم گفتگو کر رہے تھے وہ دوسرا پہلو تھا حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں، ایک شئی ایک حیثیت سے کچھ اور حکم رکھتی ہے اور دوسری حیثیت سے کچھ اور حکم رکھتی ہے، تو یہ گویا صورتِ حال ہے تو بیوی کی طرف جتنی توجہ ہوگی، جتنی محبت ہوگی اس اعتبار سے کسی اجنبیہ کی طرف توجہ نہیں ہوگی، اور یہی وہ بھید ہے کہ فقہ کی کتابوں میں ایک بحث ہے کہ امامت کا مستحق کون ہے؟ اس میں جو تفصیلات ہیں اس میں چلتے چلتے اخیر میں فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ جس کی بیوی حسین ہو، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بیوی جتنی حسین ہوگی اس کی توجہ اُدھر زیادہ ہوگی اور جتنی اُدھر توجہ ہوگی دوسری طرف توجہ کم ہوگی اور غیر کی طرف توجہ نہ ہونا یہ تقویٰ کا ایک شعبہ ہے اور متقی ہونا امامت کے شرائط میں سے ہے، اس لیے چونکہ وہ اعانتِ تقوی کا ذریعہ ہے، اس لیے اسے بھی انہوں نے وہاں ذکر کردیا۔

تو غرض یہ کہ عشقِ مجازی وہ مذموم ہے جس میں محل صحیح نہ ہو، اور اگر محل صحیح ہو اور بتلانے والا کوئی محققِ صحیح ہو محقق، یعنی اس کو تحقیق ہے، فن جانتا ہے، محقق وہ حقہ والا نہیں تو اگر وہ محقق ہو اور وہ بطورِ علاج کے کسی کو بتلائے تو اس کی گنجائش ہے۔

قوالی کو سماع سمجھنا بڑی غلطی ہے

اب رہا تیسرا مسئلہ وہ سماع ہے اس سلسلہ میں بھی امت کے بہت سے لوگ گڑ بڑی میں پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے سورت میں ایک صاحب ملے وہ کہنے لگے باوا ہم تو چشتی ہیں، لہٰذا ہمارے لیے قوالی جائز ہے تو اس کو وہ سماع کہتے ہیں۔

سماع کے معنی ہیں سننا تو سماع کی حقیقت سمجھ لیں اس سے غلط فہمی دور ہو جائے گی، کیونکہ بہت سے لوگ قوالی کو سماع سمجھتے ہیں کہ دھوم دھڑاکا ہو، مزہ آرہا ہو اور کہتے ہیں کہ ہمیں تو اس سے وجد آرہا ہے، حالانکہ وہ تو ہیجانِ نفس ہے، بلکہ تو قانِ نفس ہے۔

لطیف کو لطیف سے مناسبت ہوتی ہے

اصل میں اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کے قلب میں ایک لطیف کیفیت ہے اور خوش آوازی سے اس کے اندر میں ایک قسم کا انبساط اور ابھار پیدا ہوتا ہے، یعنی ایک قسم کی تازگی آتی ہے۔ پہلے تو آپ یہ سمجھ لیں کہ کائنات میں جتنے عناصر ہیں جیسے آگ ہے، پانی ہے، مٹی ہے، ہوا ہے وغیرہ وغیرہ اور پھر اس میں ہر ایک میں کئی کئی عناصر ہیں اس پر فلسفۂ قدیم نے بھی اور فلسفۂ جدید نے بھی کافی بحثیں کی ہیں۔

خیر! تو جتنے عناصر ہیں اس میں سب سے لطیف ''ہوا'' ہے۔ ہَوا ایسی لطیف ہے کہ وہ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتی آپ نے بھی دیکھا ہوگا ہم نے بچپن میں دیکھا ہے کہ لوگ جب پتنگ اڑاتے ہیں تو اس سے پہلے زمین پر پاؤں مارتے ہیں، تاکہ دھول اڑے تو

معلوم ہو کہ پَوَن (ہوا) کدھر ہے ، ظاہر بات ہے کہ ہوا اپنی ذات سے نظر نہیں آتی ، بلکہ دھول کے توسط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کدھر ہے ، یا آدمی کھڑا ہے اور اس کے کپڑے ہوا کی وجہ سے بدن کو چپکتے ہے تو آدمی کو احساس ہوجا تا ہے کہ ہوا کدھر سے آرہی ہے ، تو وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی انتہائی لطیف شئی ہے وہ ، اور انسان کی جو آتما ہوتی ہے وہ بھی بہت لطیف شئی ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ لطیف کو لطیف سے مناسبت ہوتی ہے ، یعنی جوڑ ہوتا ہے جیسے دو آدمی میں مناسبت ہوتی ہے ۔

وہ بھی لنگڑا اور یہ بھی لنگڑا

ایک کوّا درخت پر بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک کبوتر بھی بیٹھا تھا اب لوگوں کو تعجب ہوا کہ کوے کا کبوتر سے کیا جوڑ ؟ کیونکہ وہ دونوں ایک ہی شاخ پر بیٹھے تھے غور سے دیکھا تو وہ بھی لنگڑا اور یہ بھی لنگڑا ، تو سمجھ میں آیا کہ یہی جوڑ ہے (خطباتِ حکیم الامت ، ج٦ ص: ١٤٧) تو کسی کا کسی کے ساتھ جوڑ ہو اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے ۔

آواز کا مرکز ہوا ہے

تو ہوا جو ہے بڑی لطیف چیز ہے اور روح کے ساتھ وہ آگ کی بہ نسبت پانی کی بہ نسبت اور مٹی کی بہ نسبت زیادہ جوڑ کھاتی ہے اور آواز کے باب میں لکھا ہے کہ اس کا مرکب ہوا ہے کہ وہ ہوا پر چلتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مرتبہ اسٹیشن پر باہر کھڑے لوگ ٹرین میں بیٹھے ہوئے آدمی کو سلام کرتے ہیں ، مگر چونکہ کانچ بندھ ہوتا ہے تو اندر بیٹھنے والے کو اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے ہونٹ حرکت کررہے ہیں ، مگر وہ کیا ارشاد فرمارہے ہیں وہ پتہ نہیں چلتا ، اس لیے کہ کانچ کی وجہ سے دکھائی تو دے رہا ہے ، مگر ہوا نہیں اس لیے آواز سنائی نہیں دیتی ، تو آواز کو ہوا کے ساتھ ایک مناسبت ہے ،

بلکہ بولنے میں ہوتا یہ ہے کہ ہوا ایک انداز سے صادر ہوتی ہے، تو موٹے لفظوں میں خلاصہ یہ نکلا کہ آواز میں اور ہوا میں ایک قسم کا ربط ہے اور ہوا کو لطافت کی وجہ سے روح کے ساتھ جوڑ ہے۔

سریلی آواز سے انسان کو ایک مناسبت ہے

اسی لیے آج کل بعض ملکوں میں، ہسپتالوں میں مریض کے وورڈ میں ایک خاص قسم کے گانے شروع کئے جاتے ہیں، تا کہ مریض کو اسے سن کر ایک قسم کا انبساط ہو، اس لیے کہ گانا ایسی چیز ہے کہ آدمی لیٹا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو کھڑا ہو جائے اور اس میں بھی اشعار کی جو شکل ہوتی ہے، جیسے مثلاً ''ہدی'' عرب میں یہ ہوتا تھا کہ اونٹ سوار اونٹ پر چل رہا ہے اب اس کے ساتھ ہدی پڑھنے والوں نے ایک خاص قسم کے اشعار شروع کئے، تو ہدی پڑھنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اونٹ کو بے خودی پیدا ہوتی ہے اور وہ دوڑنا شروع کر دیتا ہے، اسی لیے پہلے زمانے میں جنگوں میں اشعار پڑھے جاتے تھے جس میں ایک خاص قسم کا مضمون بھی ہوتا تھا اور اس کا ایک لب ولہجہ بھی ہوتا تھا، تا کہ اسے سن کر لڑنے والوں میں ایک قسم کا جوش پیدا ہو۔

ہمارے دھولیہ میں میں نے دیکھا کہ کشتی ہوتی تھی تو کشتی جب ہوتی تھی تو وہ ایک خاص انداز سے ایک چیز بجاتے تھے، ہم چھوٹے تھے تو ہم بھی جاتے تھے بعد میں ہمیں منع کیا گیا تو جانا چھوڑ دیا۔ تو مجھے خوب یاد ہے وہ جب اس کو بجاتے تھے تو پہلوانوں کو تو جوش آتا ہی تھا، ہمارے اندر بھی اسے سن کر یہ کیفیت ہوتی تھی کہ ہم بھی جا کر بھڑ جائیں، یعنی اس میں ابھار کی ایک شکل ہوتی تھی تو کبھی غم کی کیفیت، کبھی خوشی کی کیفیت، کبھی غصہ کی کیفیت، مختلف قسم کے سور ہوتے ہیں۔

نوسو لہجے کا ماہر

ابراہیم نغمی ایک شخص تھا جو تقریباً نوسو (۹۰۰) لہجے جانتا تھا اُس میں سے چھ سو اس کے خود کے لہجے تھے اور تین سو دوسرے کے تو یہ بھی ایک مستقل فن ہے، اس پر بھی بعضوں نے بحث کی ہے اور حق یہ ہے کہ کوئی چیز چھوڑی نہیں ہمارے بڑوں نے، عجیب عجیب محنتیں کی ہیں۔

آواز کے ساتھ روح کو ایک مناسبت ہے

تو غرض یہ کہ آواز کے ساتھ روح کو ایک خاص قسم کی مناسبت ہے اور سماع کی صرف یہ حقیقت ہے کہ کوئی کیفیت قلب میں چھپی ہوئی ہے، اب اس کے مناسب آپ کوئی مضمون سنیں گے تو اس میں ابھار پیدا ہوگا۔

دیکھو! اس کی مثال دوں میں آپ کو کہ ایک آدمی ہے اس کے بیٹے کا انتقال ہو گیا یا اس کی بیوی کا یا اس کے کسی محبوب کا انتقال ہو گیا ہے، اب وہ چل رہا تھا راستہ میں کہ اس کے کان میں اشعار کی آواز آئی کہ کوئی شخص اشعار پڑھ رہا ہے اور جس میں محبوب کی فراق کا ذکر ہے، تو اسے سنتے ہی اس کو اپنے محبوب کا فراق یاد آجائے گا، یہ ایک طبعی اور فطری بات ہے مناسبت کی وجہ سے، تو جو کیفیت اور حالت اندر چھپی ہوئی ہے جمی ہوئی ہے اس میں ابھار پیدا کرنے کے لیے، نشاط پیدا کرنے کا کے لیے ایک چیز موجود ہے۔

حقیقتِ سماع

اتنا آپ سمجھ گئے تو اب سماع کی حقیقت سمجھیں، وہ یہ ہے کہ جو اللہ کے راستے کو طے کرنے والے سالکین ہیں، چلنے والے ہیں تو کبھی کبھی ان کے قلب میں بندش کی کیفیت ہو جاتی ہے جس کو اصطلاحِ تصوف میں قبض کہتے ہیں یا اس کو آپ ایسا سمجھ لیں

کہ کبھی آپ کی طبیعت بہت رنگ میں ہوتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ آج بہت فورم میں ہے، تو رنگ میں ہونا، فورم میں ہونا یہ ایک کیفیت ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طبیعت چلتی ہی نہیں بالکل بند ہے، بے کیف ہے، بے لطف ہے کہ کسی چیز میں نشاط نہیں تو ایک کیفیت ہے قبض کی، وہ قبضیات ہوتی ہے ٹوئلیٹ والی وہ نہیں یہ قلبی قبض ہے، تو ایک کیفیت ہے حالتِ قبض کی اور ایک کیفیت بِسط ونشاط ہے۔ تو اب ذاکر ذکر کرتا ہے رہتا ہے تو حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ حالات طاری کئے جاتے ہیں، کچھ کیفیت طاری کی جاتی ہے، اب اس کیفیات میں حکمت کیا ہے وہ بھی ایک مستقل موضوع ہے اس میں ہم نہیں جانا چاہتے ہیں، ہم صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جب کیفیت طاری ہوئی اور اس کے بعد قبض کی کیفیت پیدا ہوگئی اور سالک کے قلب میں خدا کی محبت ہے، ظاہر ہے وہ خدا کے راستے کو طے کرنا چاہتا ہے تو اب ایسی صورت میں سماع کے ذریعہ سے اس دبی ہوئی کیفیت میں ابھار پیدا کر کے اس کو کام میں لاتے ہیں بس یہ اس کی غایت اور انتہا ہے۔

اب اس کو بعد میں بیان کریں گے کہ سماع کس قسم کا ہوگا، چونکہ وہ ایک الگ چیز ہے، ورنہ ہم بلالیں اسماعیل آزاد، یا کسی اور آزاد کو کہ مزہ آجائے تو وہ سماع نہیں ہے وہ تو قوالی ہے، ویسے واقعی اس میں رنگ تو آہی جاتا ہے، کیونکہ آدمی کو اس میں نفسانی مزہ ہوتا ہے تو یہ شکل ہے۔

اور اگر ایسی صورت ہے (یعنی سماع کی) تو اس میں یہ ہوگا کہ جب وہ اس مضمون کو سنے گا ایک قسم کی لطیف آواز کو سنے گا تو بجھی ہوئی طبیعت اور چھپی ہوئی کیفیت ہے، اس میں ابھار اور انبساط پیدا ہوگا اور ایسا سمجھ لو کہ پھر وہ رنگ میں اور فورم میں آجائے گا، رغبت طاری ہو جائے گی اور وہ عمل کی طرف چل پڑے گا۔ اور اس کو موٹی سی مثال سے آپ سمجھ لیں کہ جیسے ایک لڑکا ہے وہ سست ہے باپ اس کو کہہ رہا ہے کہ سبق یاد کرو، مگر اس کی طبیعت چلتی ہی نہیں، اب باپ نے اس کو سویٹ دی اور وہ اتنی مزیدار تھی کہ منھ

میں رکھتے ہی طبیعت تازہ ہوگئی اور اس نے پڑھنا شروع کردیا تو یہ جو چاکلیٹ اس کو دی گئی ہے کھانے کے لیے تو اس سے باپ کا اصل منشاء یہ ہے کہ اس کو کھانے سے اس کی طبیعت میں تازگی پیدا ہو اور وہ اپنے اصل کام میں لگ جائے ، یہ موٹی سی بات ہے ۔ تو ٹھیک اسی طریقہ سے وہاں پر وہ علاج کے درجہ کی ایک چیز ہے کہ قلب میں جو بندش کی ایک کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہو اور وہ اپنے اصل کام میں لگ جائے ، یہ گویا سماع کی غایت ہے ، یعنی اس کا اصل مقصود ہے اور سماع کا اصلی فائدہ بھی یہی ہے ، مگر سماع جو ہے وہ ہوگا کیسے ؟ اس کے لیے چھ شرطیں لکھی ہیں کتابوں میں ۔

اور حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے اس پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے ۔ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی اس پر لکھا ہے ۔

میرا خیال ہے اب اس کو کل بیان کریں گے ان شاء اللہ ، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین

مجلس نمبر (۱۰)

شرحِ صدر ہر کام کی بنیاد ہے

مجلس نمبر (۱۰)

بسم اللّٰه الرحمن الرحیم

شرحِ صدر ہر کام کی بنیاد ہے

ہر کام میں شرحِ صدر کی ضرورت ہے، موسیٰ علیہ السلام کو جب بھیجا گیا فرعون کی طرف تو انہوں نے دعا کی ﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ ﴾(سورۂ طٰہٰ،آیت نمبر: ۲۵) معلوم ہوا کہ کسی کام میں شرحِ صدر نہیں ہے تو نہ کام میں دل جمعی ہوتی ہے نہ خلوص ہوتا ہے، تو کام میں قوت پیدا ہوتی ہے شرحِ صدر سے، سینہ کھل جائے آدمی کا تو شرحِ صدر گویا قلبی طور پر منزل کو متعین کرنا ہے، تو شرحِ صدر بنیادی چیز ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی دعا فرمائی شرحِ صدر کی، اور شرحِ صدر نام ہے اس کا کہ کسی بات پر آدمی کو بصیرت پیدا ہوجائے اور بصیرت نام ہے قلب کی نگاہوں کا، ظاہری نگاہ بصارت کہلاتی ہے اور دل کی نگاہ بصیرت کہلاتی ہے اور جب تک شرحِ صدر نہ ہو دینی کام آدمی کیسے کرسکے گا، تو سب سے پہلے تو یہ فرمایا کہ میرا سینہ کھل جائے یہ اندر کی چیز ہے۔

جس کام کو آدمی اپنا کام سمجھتا ہے وہ آسان ہوجاتا ہے

اس کے بعد فرمایا کہ ﴿ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ ۝ ﴾(سورۂ طٰہٰ،آیت نمبر:۲۶) میرے کام کو اور میرے امر کو آسان فرمادے، تو تیسیر کی دعا کی جیسے آدمی حج کا یا عمرہ کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے " اللّٰهم إني أريد الحج " پھر کہتا ہے " فيسره لي " تو تیسیر اور آسان کرنے سے چیز کا وجود ہوگا، عمل میں آئے گا وہ اور پھر " و تقبله مني " (ہدایہ ج۱،ص:۲۱۶)

کہ قبول فرمائیں آپ یہ اس کا اثر اور نتیجہ ہے۔اور عمرہ میں پڑھتا ہے " اللّٰهم إني أريد العمرة فيسرها لي وتقبلها مني " ۔(بدائع الصنائع ج۲،ص:۱۴۴)

تو پہلے تو ارادہ ہے جو اندر سے ہے پھر تیسیر ہے جو باہر سے ہے اور قبول ہونا وہ اس کی غایت اور نہایت ہے ،تو یہاں بھی ﴿ ويسر لي أمري ﴾ کہ میرے امر کو آسان فرما دیجئے ،تو کام تو یہ سپرد کیا تھا کہ فرعون کو جا کر دعوت دی جائے اور ظاہر بات ہے کہ دعوت کا کام یہ دینی کام ہے ،تو یوں فرمانے کے بجائے کہ " ويسر أمر الدين " یوں فرمایا" ويسرلي أمري " میرے امر کو آسان فرما دیجئے اس سے قلبی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے دینی کام کو اپنا کام سمجھا اور جس کام کو آدمی اپنا کام سمجھ لے تو پھر وہ آسان ہوجاتا ہے اس سے ان کی دینی حمیت ، دینی لگاؤ اور اخلاص کا پتہ چلتا ہے ، بلکہ دینی فنائیت کا پتہ چلتا ہے کہ اپنا کوئی کام نہیں بس دینی کام کو اپنا کام سمجھا۔

تمہارا کیا بنے گا وہ تم جانو

ساؤتھ افریقہ میں ایک جماعت گئی وہاں ایک آدمی نے ان سے کہا کہ تمہارا کوئی دوسرا دھندھا بھی ہے کہ نہیں بس پھرتے رہتے ہو پوٹلے لے لے کے، وہ آدمی بڑا ظریف اور ذکی تھا اس نے کہا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ پوچھے تو آپ یوں ہی کہہ دینا کہ ان کا اس کے سوا کوئی دھندھا نہیں تھا،تو ہمارا تو کام بن جائے گا،تمہارا کیا بنے گا وہ تم جانو (فیضِ ابرار ج۲،ص: ۶۹) تو وہ ایک دھن کی بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان حضرات کی دھن قابلِ تعریف ہے۔

جواب خود آیت میں موجود ہے

تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ اس سے اخلاص کا بھی اور فنائیت کا بھی پتہ چلتا ہے پھر

فرمایا کہ ﴿ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُ قَوْلِيْ ﴾(سورۂ طٰہٰ، آیت نمبر: ۲۷، ۲۸) ”میری زبان کی گرہ آپ کھول دے ایسی کھول کے وہ کلام کو سمجھ لے“۔

ایک طالبِ علم نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے بخاری کے درس میں سوال کیا کہ حضرت اس دعا کے بعد بھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت باقی تھی تو فرمایا کہ اس کا جواب تو خود آیت میں ہے ” عقدة من لساني “ یہاں ” من “ تبعیضیہ ہے کہ ایسا کھل جائے جس سے وہ بات سمجھ لے، اس سے معلوم ہوا کہ اصل شئی بات کا واضح کر دینا ہے زورِ بیان نہیں ہے۔

حقیقتِ فقہ

اور اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ سامعین میں فقہ پیدا کرنا ہے، اس لیے کہ ادھر فرعون ہے اور ” یفقھوا “ کی ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ بات کی روح کو پالے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو ذریعہ ہے تبلیغِ دین کا وہ بھی مطلوب ہے، تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ” یفقھوا قولي “ اور فقہ کہتے ہیں کسی شئی کی روح پر مطلع ہونے کو جس میں قوتِ فکریہ ہوتی ہے۔

فقاہت کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شئی کو دوسری شئی پر قیاس کرے اور نتیجہ صحیح نکالے اور قرآنِ کریم سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔

میں نے طلباء سے جلالین کے درس میں یہ بات کہی کہ منافقین نے کہا تھا ﴿ لَا تَنْفِرُوْا فِيْ الْحَرِّ ﴾ کیونکہ جہاد شدید گرمی کے موسم میں آیا تھا تو انہوں کہا ﴿ لَا تَنْفِرُوْا فِيْ الْحَرِّ ﴾ (سورۂ توبہ، آیت نمبر: ۸۱) تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿ قُلْ ﴾ آپ ان سے کہئے ﴿ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَراًّ ﴾ (سورۂ توبہ، آیت نمبر: ۸۱) کہ ” جہنم کی آگ اس سے بہت زیادہ سخت ہے“ دنیا کی گرمی اگر نا قابلِ برداشت ہے تو جہنم کی گرمی تو اس سے زیادہ سخت ہے،

معلوم ہوا کہ اس کو اس پر قیاس کریں کہ یہ برداشت نہیں ہوتی تو وہ کیسے برداشت ہوگی تو اس کو اس پر قیاس کروایا گیا یہی فقہ ہے۔

اور آگے فرمایا گیا کہ ﴿ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ٥ ﴾ (سورۂ توبہ، آیت نمبر:۸۱) ''کاش ان میں تفقہ ہوتا کہ وہ اس کو سمجھ لیتے''۔تو آیت سے یہ نکلا کہ ایک شئی سے دوسری شئی کی طرف جانا جیسے '' الأشباه و النظائر '' ہے ابن نجیم رحمہ اللہ کی اس طریق پر گویا آدمی سمجھے۔

دعوت، تبلیغ اور تحدیث، ہر ایک کے لیے شرحِ صدر کی ضرورت ہے

تو غرض یہ کہ پہلی چیز شرحِ صدر ہے اور موقع ہے دعوت کا تو معلوم ہوا کہ داعی کو شرحِ صدر ہونا چاہیے، کیونکہ یہاں شرحِ صدر کا ذکر ہے اور دوسری جگہ فرمایا ﴿ عَلٰى بَصِيْرَةٍ ﴾ (سورۂ یوسف، آیت نمبر: ۱۰۸) وہاں بصیرت کا لفظ استعمال کیا ہے اور تحدیث کے لیے بھی شرحِ صدر چاہیے جیسے نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا کہ ﴿ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ٥ ﴾ (سورۂ ضحیٰ آیت نمبر:۱۱) آپ اپنے رب کی نعمت کو بیان کیجئے۔

نعمت سے مراد یہاں دین ہے تقریباً چودہ معانی میں نعمت کا لفظ قرآنِ کریم میں استعمال ہوا ہے اور یہاں دین مراد ہے۔ اور اگر آپ کو تردّد ہو کہ تحدیث کروں کیسے؟ تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تردّد اور تشویش کی ضرورت کیا ﴿ أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ٥ ﴾ (سورۂ الم نشرح، آیت نمبر:۱) حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا، تو معلوم ہوا کہ تحدیث کے لیے بھی شرحِ صدر کی ضرورت ہے، تو تبلیغ ہو تو شرحِ صدر، دعوت ہو تو شرحِ صدر، تحدیث ہو تو شرحِ صدر کی ضرورت ہے۔

حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا ایک حکیمانہ ملفوظ

اور حدیث جو ہے دین کی ایسی اصل ہے جو مرکزی ہے اور بقول حکیم الاسلام رحمہ اللہ کہ حدیثِ پاک شرعی اصل ہے جس سے شریعت کھلتی ہے، اور قرآنِ کریم تشریعی اصل ہے جس سے شریعت بنتی ہے، اور فقہ تفریعی اصل ہے جس سے شریعت پھیلتی اور منضبط ہو کر آئین کی صورت اختیار کرتی ہے (حکیم الاسلام رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند کی ایک مظلوم شخصیت ج ۱، ص: ۴۳۸) تو قرآنِ کریم سے بنتی ہے، حدیث شریف سے کھلتی ہے، اور فقہ سے پھیلتی ہے۔ اور قرآنِ کریم میں جو فرمایا کہ ﴿ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ ﴾ (سورۂ نحل، آیت: نمبر: ۴۴) ''ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا'' اس سے قرآنِ کریم مراد ہے۔

اور ﴿ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾ (سورۂ نحل، آیت نمبر: ۴۴) ''تاکہ جو چیز ان کی طرف نازل کی گئی ہے آپ اس کی وضاحت کریں'' اس سے حدیث ثابت اور ﴿ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o ﴾ (سورۂ نحل، آیت نمبر: ۴۴) اس سے فقہ ثابت۔

اب ایک سوال یہاں رہ جاتا ہے کہ جب آپ ﷺ قرآنِ کریم کی وضاحت فرمادے پھر فقہ کا کیا حاصل؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o ﴾ اس سے ادھر اشارہ ہے کہ نبوی کلام میں جتنی مراداتِ ربانی کھولی گئی ہیں اور نبی کریم ﷺ نے جس طرز پر قرآنِ کریم کی تصریح فرمائی ہے اسی دائرہ میں فکر مطلوب ہے، اس سے ہٹکر مذموم ہے، اس لیے کہ فرمایا ﴿ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o ﴾ تو "لتبین للناس" یہ تو گویا غایت ہوئی کہ آپ وضاحت کریں اور آپ کی وضاحت کے بعد تفقہ ﴿ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o ﴾ ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ کی بیان کردہ اشیاء میں سے تفکر وفکر سے آدمی کام لے تو اس سے حقائق کھلیں گے اور علماء ربانیین مجتہدین نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔

عزیمت کی ترغیب ہے، مگر تیسیر مطلوب ہے

غرض یہ کہ شرحِ صدر یہ بنیادی چیز ہے اور اس سے اخلاص بھی معلوم ہوتا ہے، تو اس سے علم بھی ثابت، تبلیغ بھی ثابت، تفقہ بھی ثابت، اس کے ساتھ عبدیت بھی، کیونکہ مشکلات پر اپنے کو پیش نہیں کیا جارہا ہے، بلکہ تیسیر پر پیش کیا جارہا ہے۔ فرمایا کہ ﴿ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ ۝ ﴾ تو اس سے پتہ چلا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی چیز آئے اور جب تک ادھر سے تیسیر کی شان نہ ہو آدمی اسے انجام نہیں دے سکتا۔

اس سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی بالغ نظری کا بھی پتہ چلتا ہے، کیونکہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ سفر میں جو ہے قصر ہی پسندیدہ ہے (مرغوب الفتاوی ج ۳، ص: ۵۴) اس لیے کہ وہ تیسیرِ خداوندی کو قبول کرنا ہے اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں ہے کہ جب " أمرين " پیش آتے تو آپ آسان کو اختیار فرماتے تھے (زاد المعاد) اس کا منشاء بھی عبدیت ہے تو ترغیب ضرور ہے، مگر عام حالات میں تیسیر مطلوب ہے۔ اس کو آپ بالکل ایسے سمجھ لیں کہ مطلوب تو صحت ہے مرض مطلوب نہیں ہے، ہاں! بیماری اگر آجائے تو صبر وتحمل سے کام لیں اور پھر بیماری مانگی نہیں جائے گی، مانگی تو جائے گی صحت۔

صحت کا مدار عفت پر ہے

فرمایا کہ " اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الصِّحَةَ وَالْعِفَّةَ وَالْأَمَانَةَ وَحُسْنَ الْخَلْقِ وَرِضَا بِالْقَدْرِ " (بیہقی فی الدعوات الکبیر) اس سے ایک نکتہ اور کھلا کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں صحت کا طالب ہوں اور ظاہر ہے صحت کے بگاڑ میں مادے کا ضائع ہونے کا بڑا دخل ہے، کیونکہ چالیس لقمے سے ایک قطرہ خون اور چالیس قطرے سے ایک قطرہ منی بنتا ہے اور فجور کی جو شکل ہے اس میں مادۂ منویہ زیادہ ضائع ہوتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منی چہرے کی رونق اور پنڈلی کا گدا ہے، چاہے تو آدمی اس کو باقی رکھے اور چاہے تو ضائع کردے تو صحت مانگی۔ اس کے بعد عفت کا ذکر ہے کہ عفت سے ہٹ کر اگر فجور اختیار کیا تو آخرت تو بگڑے گی ہی، دنیا میں بھی اس کی صحت خراب ہوگی، اس لیے جو لوگ فسق وفجور میں ہوتے ہیں ان کی قلبی فرحتیں رخصت ہوجاتی ہیں، بلکہ فجور کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ متخیلات میں جماؤ نہیں رہتا، اس لیے کہ آدمی فسق کا عادی ہو تو یکسوئی نہیں ہو سکے گی اور قوتِ متخیلات کا تعلق اعصاب سے ہے اور اعصاب ہوجاتے ہیں متأثر تو جب غلط کاری ہوگی تو اعصاب متأثر ہوں گے اور اعصاب سے قوتِ متخیلات کا تعلق ہے تو یکسوئی مفقود ہوجائے گی اور جب یکسوئی مفقود ہوگی تو ادھر اُدھر سوئی چبھے گی اور پھر پریشانی ہی پریشانی ہوگی۔ تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ صحت کے لیے عفت موقوف علیہ ہے۔

عفت حاصل ہوتی ہے امانت سے

اور ظاہر بات ہے عفت حاصل ہوتی ہے خیانت سے بچنے سے، اسی لیے بدنگاہی کو قرآنِ کریم میں ﴿ خَآئِنَةَ الْأَعْيُنِ ﴾ سے تعبیر کیا ہے، اور یہاں امانت کا لفظ ذکر کیا کہ " اللّٰهم إني أسئلك الصحة والعفة والأمانة " ویسے بھی خیانت میں خائن کے قلب میں دغدغہ رہتا ہے تو طمانینت فوت ہے، اور " خائنة الأعين " جو ہے وہ تقوی کے لیے مضر ہے کہ نظر ہی سے تو معاملہ آگے بڑھتا ہے۔

پہلے اٹھتی ہے نظر پھر بڑھتے ہیں قدم

اور پھر " ما بین القدمین " تو ہوتا ہی ہے اس کا نتیجہ، تو بنیادی چیز گویا یہی ہے۔

شرحِ حدیث بھی ہوگئی

اور پھر اس کے بعد مجموعی طور پر " حسن الخلق " حسنِ خلق کو مانگا گیا ہے اور اس میں یہ سب چیزیں آ گئیں، تو بظاہر تو وہ منشاءِ خداوندی پر ہے، مگر چونکہ قلب کو کیا حالات پیش آ جائیں کچھ کہا نہیں جا سکتا تو " ورضا بالقدر " کو مانگ کر سارے معاملات میں اپنے لیے طمانینت کا سامان پیدا کیا، تو یہ حدیث کی شرح بھی ہو جائے گی ایک اعتبار سے۔

یہ امت بھی بڑی، لہٰذا اس کا فرعون بھی بڑا

تو غرض یہ کہ سب سے پہلی چیز شرحِ صدر ہے، اور لفظ '' رب '' یوں مفہوم دے رہا ہے یہاں کہ آپ نے بچپن سے جو خاص تربیت کا معاملہ فرمایا کہ مہالک میں میرے لیے حفاظت کی شکل فرمائی ہے تو اب دینی اعتبار سے یہ ایک مہلکہ تھا، اس لیے کہ بہت بڑا سرکش تھا فرعون فرمایا کہ ﴿ اِذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهٗ طَغٰىO ﴾ (سورۂ طٰہٰ، آیت نمبر: ۲۴) معلوم ہوا کہ اس میں طغیان تھا یہ الگ بات ہے کہ اس امت کا فرعون ابو جہل تھا اور اس کے بارے میں ہے کہ ﴿ كَلَّآ إِنَّ الإِنْسَانَ لَيَطْغٰىO ﴾ (سورۂ علق، آیت نمبر: ٦) یہاں لام تاکید کا لا کر اس کے طغیان کو اور واضح کیا گیا کہ وہ تو ڈوبنے لگا تو کلمہ پڑھنے لگا اور یہ مرنے لگا تو چاہتا تھا کہ گردن نیچے سے کٹے، تاکہ ممتاز معلوم ہو (سیرۃ المصطفی حصہ اول ص: ۵۷۰) وہاں مرتے مرتے " انقیاد " آیا اور یہاں مرتے مرتے " استکبار " آیا اور چونکہ یہ امت بڑی ہے اس لیے اس کا فرعون بھی بڑا۔

سید الجہل نہ کہنے کی وجہ

اور اس کو ابو جہل کہا گیا سید الجہل نہیں کہا، اس لیے کہ سیادت آتی ہے اوپر سے اور ظلومت وجہولت یہ اندر سے چلتی ہے اور جہل انسان کا خانہ زاد ہے، اس لیے ابو جہل کہا

گیا سید الجہل نہیں کہا گیا، اور بہت بڑا سر تھا اس کا اور عجیب وغریب کیفیت تھی اس کی کہ ایک طرف تو یہ کبر اور مرض تھا اُبٰی کا یعنی مفعول تھا وہ اللہ تعالیٰ کی شان۔

دعاؤں کے شروع میں " اللّٰھم " اور " رَبَّنَا " کیوں؟

تو بات اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر چل رہی تھی ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا گذشتہ سال جب میں مالیگاؤں گیا تھا، وہاں کہ دعاؤں سے پہلے عامۃً " اللّٰھم " آتا ہے یا " ربنا " اس کی کیا وجہ؟ تو '' ملا آں باشد کہ چپ نہ شود'' تو میں نے کہا کہ ایک بات تو یہ کہ یہ لفظ " اللّٰھم " اصل میں تھا " یا اللّٰہ " اور عربی کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز ہٹا دی جاتی ہے تو اس کے عوض میں کچھ دے دیا جاتا ہے جیسے مثال کے طور پر '' مضارع '' پر " لم " آجائے تو وہ ماضی کہ معنی میں ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ '' دنیائے مضارع '' میں ایک قسم کی تشویشات پیدا ہوگیں کہ ہمارا ایک کھینچ لیا ماضی نے (حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات ہنستے ہوئے فرمائی) تو صرفیوں نے انصاف یہ کیا کہ " إنْ " لگا دیا گیا ماضی پر تو وہ '' استقبال '' کے معنی میں آجاتا ہے تو ایک لفظ انہوں نے کھینچا تو ایک انہوں نے کھینچا اس طرح سے۔

تو غرض یہ کہ صورتِ حال یہ ہے کہ یہ تھا " یا اللہ " تو " یا " ہٹا لیا اور اللہ میں وہ نکتہ جو میں نے پرسوں سنایا تھا وہ یاد ہوگا تو غرض یہ کہ '' یا '' ہٹا دیا تو اب " اللّٰہُ " ہے، تو آخر میں میم بڑھا دیا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سارے حروفِ تہجی میں سے میم ہی کا انتخاب کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میم جمع کے لیے آتا ہے یہ عربی کا قاعدہ ہے " ھو ، ھما ، ھم ، مم ، علیکم "، پھر اشکال یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے لیے تو توحید لگی ہوئی ہے وحدت اس کے لیے ذاتیات سے ہے پھر جمع کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ذات ایک ہے، مگر صفات اس کی متعدد ہیں تو اس صورت میں گویا ذات مع جمیعِ صفات

حق تعالیٰ سے دعا کر رہا ہے بندہ اور " ھم " میں ضمیر سے التباس تھا اس لیے مشدد کر دیا اور فتحہ " أخف الحرکات " ہے، اس لیے وہ دے دیا گیا (مسائل الصرف والنحو) یہ تو خیر آپ کے لیے تشویش کا سامان ہے یہ تو شرحِ جامی کی تقریر ہو جائے گی، تو غرض یہ کہ سب سے بڑی چیز شرحِ صدر ہے۔

قلب کی دو کھڑکیاں ہیں

اس سے ایک چیز یہ نکلی کہ کام سے پہلے دعا ہونی چاہیے یہ عبدیت ہے، تو شرحِ صدر بڑی چیز ہے اگر شرحِ صدر پر کچھ اور تفصیل کی جائے تو اس سے بہت سی چیزیں اور بھی نکل سکتی ہیں۔

لکھتے ہیں محققین کہ قلب کی دو کھڑکیاں ہیں: ایک فوقانی ہے اور ایک تحتانی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ آپریشن کرا کے اس کو دیکھیں تو اوپر کی کھڑکی کھلتی ہے تو اس سے فتوحاتِ غیبیہ کھلتے ہیں اور اگر نیچے اس کا روخ ہو جاتا ہے تو چونکہ طبیعت اس سے متعلق ہو جاتی ہے اور طبیعت منشاء ہے خواہش کا جیسا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ حجۃ اللہ میں لکھتے ہیں، تو اس صورت میں وہی قلب فساد کی طرف چلتا ہے تو قلب محل ہے احوال کا، کیفیات کا، اب وہ کیفیات جس طرف رخ کر لیں گی وہ ادھر ہو جائے گا۔

شرحِ صدر کی دو قسمیں ہیں

اور ''شرح'' جو ہے اس کا تعلق ہے اسلام سے ﴿ أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلإِسْلَامِ ﴾ (سورۂ زمر، آیت نمبر: ۲۲) تو ایک شرحِ صدر ہر مسلمان کو حاصل ہے، جیسے ولایت کا ایک درجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان ولی ہے ﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت نمبر: ۲۵۷)۔

بھروچ میں میری تقریر تھی تو میں نے کہا کہ بھروچ میں تو اولیاء کی کمی ہے ہی نہیں، کیونکہ ولی ہی ولی ہے یہاں پر، تو ایک تو ولایتِ عامہ ہے کہ ہر شخص ولی ہے، جیسے کسی کے پاس دس روپئے ہو وہ بھی غنی کہلاتا ہے، اور ایک ولایتِ خاصہ ہے جیسے عرف میں اسی کو مالدار کہتے ہیں جس کے پاس مال کی بڑی مقدار ہو، تو دین میں بھی ایک خاص قسم کی نسبت حق تعالیٰ سے حاصل ہو جائے وہ درحقیقت ولایت ہے اور اس کے حصول کے لیے بنیادی چیز اتباعِ شریعت ہے، اور لوگوں نے پتہ نہیں کیا کیا الا بلا بھر رکھی ہے تصوف کے اندر، کتاب وسنت کا علم نہ ہونے یا اپنی دکان چمکانے کے لیے بہت سی خرابیاں پیدا کیں لوگوں نے۔

تو غرض یہ کہ ایک ولایتِ عامہ ہے اور ایک ولایتِ خاصہ ہے۔ اسی طرح ایک شرحِ صدر عامہ ہے اور ایک شرحِ صدر خاصہ ہے، پھر جتنا تعلق مع اللہ ہوگا اسی اعتبار سے شرحِ صدر میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، تو غرض یہ کہ شرحِ صدر حق تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسباب اس کے اختیاری ہیں جیسے ولایت ہے اور یہ بھی حقیقۃً عطائے ربانی ہے، مگر اسباب اس کے اختیاری ہیں، اور نبوت جو ہے وہ اختیاری نہیں ہے نبوت کو ایسا سمجھ لیں جیسے گریٹ ہوتا ہے اور ولایت کو ایسے سمجھ لیں جیسے ڈگری، تو ڈگری تو جو ہے اختیاری ہے، مگر یہاں بھی ذہن میں رہے کہ اصل فیضان جو ہے وہ تو حق تعالیٰ کی عطا ہے، مگر یہ کہ آدمی محنت وکوشش کرتا رہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے

اور جب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اصل دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں تو اس سے کبر نہیں آپاتا۔ ایک مرتبہ حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ زور سے چیخے تہجد کا وقت تھا، کچھ لوگ پہنچے پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے؟ تو فرمایا کہ میں ایک کتاب دیکھ رہا تھا اس میں میں نے

پڑھا کہ کسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے ناراض ہو کر اولیاء کی ولایت سلب فرمالی اس لیے میں چیخا، وہ بے نیاز ہے جب چاہے جس سے لے لیں اور جب چاہے جسے دے دیں، تو بندے کے لیے سوائے بے چارگی اور عبدیت کے کوئی راہ نہیں ہے۔

قربِ الٰہی کے حصول کا نسخہ

سید احمد رفاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ساری زندگی کی کاوشوں اور کوششوں کے بعد میں اس نکتہ پر پہنچا ہوں کہ اتباعِ سنت اور بندگی اور شرمندگی کے سوا قربِ خداوندی کا راستہ کسی اور چیز سے طے نہیں ہوتا ہے۔ (آئینۂ سلوک، ص: ۲۰۸)

کبر اُمّ الامراض ہے

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کبر جو ہے تمام رذائل کی اصل ہے اور کفر کا منشاء بھی خود کبر ہے اور دوسری جتنی بھی چیزیں ہیں ان تمام میں بھی بنیادی چیز یہی ہے۔ میں نے دیکھا بعض کتابوں میں کہ اگر کبر کا ازالہ ہو جائے تو تمام رذائل دور ہو جاتے ہیں اور سب سے اخیر میں یہ جاتا ہے کبر کو جاہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، ایک ہوتی ہے قوتِ باہ اور ایک ہوتی ہے قوتِ جاہ، تو جاہ کے اندر تو آدمی اکڑتا ہے اور باہ کے اندر جھکتا ہے آدمی کہ اگر جھکے نہیں تو باہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔ باہ جو ہے خواہش والا گناہ ہے، جیسے مثلاً زنا ہے، تو جاہ ایسے ہے جیسے کرسی، اور باہ ایسے ہے جیسے زنا، تو جاہ میں تو اکڑتا ہے اور باہ میں جھکتا ہے، مگر آپ غور کریں کہ یہ دونوں جو چیزیں ہیں اس میں سے جاہ میں سے شروع میں سے ''جیم'' نکال دیں اور باہ کے شروع میں سے ''باء'' نکال دیں، تو سوائے ''آہ'' کے کوئی انجام نہیں ہے، کیا آدمی تکبر کرے کہ سوائے خسارے کے اس میں کچھ بھی نہیں ہے، تو سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حقیقت کھل جائے، قرآنِ کریم میں ہے ﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾(سورۂ جاثیہ،آیت نمبر:۳۷) اور حدیث شریف میں ہے " العظمة إزاري والكبرياء ردائي "(ابو داود شریف) کہ "عظمت میری ازار ہے اور کبریائی میری چادر ہے" کبریائی کا درجہ عظمت سے بڑھ کر ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیرِ کبیر میں لکھا ہے کہ چونکہ ازار تحتانی ہوتی ہے اور چادر فوقانی (فیضِ ابرار ج۱۰،ص:۲۱) یہ الگ بات ہے کہ حق تعالیٰ کے لیے جو الفاظ استعمال کئے جائیں اس کی کیفیت کا تعین ہم آپ نہیں کر سکتے ، جیسے امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے وہ فرماتے ہیں کہ " أما الاستواء معروف ، وأما الكيف مجهول ، والعلم به واجب ، والسؤال عنه بدعة "(خطبات حکیم الاسلام ج۲،ص: ۵۹۰) سلف کا مذہب یہی تھا،تو ایسے الفاظ جب آجائیں تو اس وقت بس تفویض سے کام لیا جائے ۔

ما اتخذ الله جاهلاً ولياً

تو خیر! شرحِ صدر جب آجاتا ہے تو تقوی طہارت اور اجتناب عن المعاصی حق تعالیٰ نصیب فرماتے ہیں تو شرحِ صدر ولایت کے اسباب میں سے ہے۔اس سے ایک مسئلہ یہ بھی کھلا کہ جو صوفیاء لکھتے ہیں کہ " ما اتخذ الله جاهلاً ولياً "اور حق تعالیٰ جب کسی اَن پڑھ کو ولایت دے دیں تو اس کو علم سے سرفراز فرماتے ہیں ، چنانچہ ظاہری علم کم ہے ، لیکن شرحِ صدر ہوتا ہے ادھر سے ، واردات کا دروازہ کھل جاتا ہے ، اور جو لوگ مجذوب قسم کے ہوتے ہیں وہ مکلّف نہیں ہوتے ، لہٰذا ان کا اتباع نہیں کیا جائے گا اور ان کی مذمت بھی نہیں کی جائے گی ، اتباع ہوگا نبی کریم ﷺ کا چونکہ معیار نبی کریم ﷺ ہیں۔

ہر چیز کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت

اس کو موٹے لفظوں میں آپ ایسا سمجھ لیں کہ کسی چیز کی دو شکل ہوتی ہے : ایک اس

کی صورت، دوسری اس کی حقیقت، اور یہ ''عالمِ صور'' ہے صورتوں کا عالم، حقیقتیں اس کی صورتوں میں چھپی ہوئی ہیں، گلاب کی حقیقت اس کے پھول میں چھپی ہوئی ہے اور معانی کی حقیقت الفاظ میں چھپی ہوئی ہے، اسی لیے ممکن نہیں ہے کہ آپ الفاظ میں ردّوبدل کردیں اور زبر کے ساتھ زبردستی کریں اور اس کی صورت بگاڑ دیں پھر بھی معنی محفوظ رہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ اس سے ایک مسئلہ اور کھلا کہ ظاہری شریعت کی خلاف ورزی کرے اور اس کا اثر باطن پر نہ پڑے یہ نہیں ہوسکتا، باطن ضرور متأثر ہوگا۔ تو صورت محافظ ہے حقیقت کی کہ حقیقت کو وہ چھپائے ہوئے ہیں اپنے اندر۔

توحید کا محلِ اصلی قلب ہے

تو دو چیزیں ہیں: جیسے " لا إله إلا الله " کی حقیقت توحید ہے اور توحید کا محلِ اصلی قلب ہے، ایمان اسی لیے مؤمن جاگتا ہو تب بھی مؤمن، کلمہ کا تلفظ کرے تب مؤمن، حتی کہ سویا ہو تب بھی مؤمن، ورنہ ایسا ہوتا کہ سوتے ہی نکاح ٹوٹ جائے اور نکاح کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔

تو غرض یہ کہ ایمان جو ہے انسان میں بہر صورت ہے اور وہ اندر کی ایک حقیقت ہے اور الفاظ اس کے ترجمان ہیں، اس لیے اس کی فقہی تعریفات کی گئی ہیں کہ کوئی آدمی گونگا ہو تو کیا ہے وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ اصل حقیقت وہی ہے۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ سے دو مسئلے اور کھل جاتے ہیں

مگر توحیدی حقیقت کے کچھ مظاہر بھی اس عالم میں ہونے چاہئیں تو اس حقیقتِ شرعیہ اور حقیقتِ توحیدیہ کی ایک ظاہری صورت شریعت ہے کہ جس کا مجسم نمونہ نبی کریم ﷺ ہے، تو اب ہم تلخیص کے طور پر اور خلاصہ کے طور پر یہ کہہ لیں کہ '' لا الہ الا اللہ''

ایک حقیقت ہے ایمانی اور ''محمد رسول اللہ ﷺ'' اس کا ظہور ہے اس عالم میں۔ اس سے دو مسئلے اور کھل جاتے ہیں: کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' سے توحید بنی، جب توحید بن گئی تو طبعاً شرکیت کی نفی ہوجائے گی اور ''محمد رسول اللہ'' سے درحقیقت سنت بنتی ہے، جب سنت کی حقیقتیں ثابت تو بدعت کی ساری جڑیں خود بخود مٹنا شروع ہوجائیں گی۔

(مجالسِ حکیم الاسلام ج ۲، ص: ۱۶۰)

تو ایک سے توحید ثابت لہٰذا شرکیت کی نفی اور دوسرے سے سنت ثابت لہٰذا بدعات کی نفی، تو یہ دونوں چیزیں گویا ازخود اس سے دور ہونا شروع ہوجائیں گی۔

ایک غلط سوچ اور اس کی اصلاح

تو خیر! میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ یہ ''عالم صور'' ہے، مگر حقیقتیں صورتوں کے ضمن میں ہیں، اس لیے صورتوں کو چھوڑ دینا حقیقتوں کو فوت کر دینا ہے، لہٰذا جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی نظر صرف قلب اور نیتوں پر ہے وہ انہیں دیکھتے ہیں، تو ایسوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جنھوں نے نیت کی عظمت واضح کی انھوں نے ہی ظاہر کا اہتمام کیا اور کروایا ہے، یہ غلط بات ہے جو وہ کہتے ہیں، جیسے عبارت بدل دے معنی رخصت، پھول کو آپ مسل دیں تو خوشبو رخصت، تو دنیا میں تو ظاہر سے باطن متأثر ہوتا ہی ہے، اور آپ حقیقتِ شرعیہ کے باب میں یہ کیسے قائل ہیں کہ ظاہر کا کچھ بھی اعتبار نہیں اصل تو اللہ میاں دل دیکھتے ہیں، جیسے مثلاً ڈاڑھی کٹانے والے، ڈاڑھی کٹانا یہ گناہ کی بات ہے گناہ بھی ایسا کہ چوبیس گھنٹے نبیٔ کریم ﷺ کے چہرے سے مخالفت (ڈاڑھی کا وجوب) اور ایک بات اور میں کہتا ہوں اپنے بھائیوں سے بڑی محبت سے کہ اگر نفس کی وجہ سے یہ کام ہوجاتا ہے تو شرمندہ رہے آدمی، گناہ پہلے زمانے میں بھی ہوتے تھے، لیکن لوگ عام طور پر شرمندہ رہتے تھے۔

چوری اوپر سے سینہ زوری

اب مصیبت یہ ہوگئی کہ وہ کبڑے والی بات کہ اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہاری کمر سیدھی ہوجائے یا سب کی تمہاری طرح کمر ٹیڑھی ہوجائے تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہنے لگا کہ سب کی کمر میری طرح ہوجائے (خطباتِ احتشام) جیسے روزہ نہ رکھنے والے زیادہ چاہتے ہیں کہ چاند جلدی سے عید کا نظر آجائے، تاکہ سب لوگ ان کی طرح ہوجائیں تو یہاں بھی یہی شکل ہے کہ ''چوری اوپر سے سینہ زوری''۔

میں ایک واقعہ سناؤں ہمارے پڑوس میں ایک صاحب تھے گریجوٹ، ایک مرتبہ میں بازار سے کچھ سبزی خرید کر لا یا راستے میں ملاقات ہوگئی، کچھ چار پانچ جوان تھے ان کو بڑا غرہ تھا اپنے دنیوی علوم پر، انہوں نے دیکھا کہ یہ مولوی ٹائپ آدمی ہے تو کچھ بات نکل آئی تو وہ کہنے لگے کہ مولانا ڈاڑھی رکھنا سنت ہے یہ کیسے معلوم ہوا؟ پروف کیا ہے؟ وہ میری نوعمری کا زمانہ تھا اور دینی حمیت بھی جوش میں آئی، مگر میں نے ان سے ایسا رخ نہیں برتا۔ میں نے کہا دیکھئے! آپ پوچھ رہے ہیں سنت ہے یا نہیں ہے؟اور ہے تو ثابت کریں میں آپ سے صرف یہ بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟ اور آپ کی عمر شریف کیا ہے؟ تو کہا چھبیس یا ستائیس سال، میں نے کہا اسلام کو آپ نے ریسرچ کر کے قبول کیا ہے یا ایسے ہی تقلیداً؟ اب وہ پھنسے اگر تقلیداً کہتے ہیں تو ان کی علمی شان پر اثر پڑتا ہے اور اگر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ریسرچ کر کے تو اور زیادہ پھنستے ہیں۔

خیر! انہوں نے کہا کہ ہم نے تحقیق کے ساتھ اسلام قبول کیا ہے، میں نے کہا آپ یہ بتائیے کہ سنت کسے کہتے ہیں؟ سنت کی کیا تعریف ہے؟ کیونکہ پانی پینا بھی سنت تو پانی تو کافر بھی پیتا ہے اور یہودی بھی پیتا ہے، میں نے کہا اگر آپ سنت کی جامع تعریف

کردیں تو میں اپنی پوری لائف آپ کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا اور یہ بات آپ اسٹمپ پیپر پر لکھوا لینا، اب وہ بغلے جھانکنے لگے کہ نہیں مولانا ایسی بات نہیں ہے، میں نے کہا نہیں ایسی بات نہیں، میں تو آپ سے سنت کی تعریف پوچھ رہا ہوں پھر میں نے کہا دیکھو! نفس کی وجہ سے اگر گناہ ہو رہا ہے تو شرمندہ ہونا چاہیے کہ یا اللہ ہم گناہگار ہیں ہم کو ہدایت دے، مگر یہ جو شکل ہے اس کا حاصل گویا یہ ہے کہ آدمی ''چوری بھی کرے اور سینہ زوری بھی'' یہ تکلیف کی بات ہے، آدمی سے کوتاہی ہو تو کہے کہ میں شرمندہ ہوں۔

(فیضِ ابرار ج۹، ص: ۱۶۶)

دندان شکن جواب

ورنہ مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے بارے میں ہے جب وہ شہید نہیں ہوئے تھے اس وقت کی بات ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا حضرت ایک سوال ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس وقت اس کی ڈاڑھی نہیں ہوتی وہ آتی ہے بعد میں، معلوم ہوا کہ وہ زائد چیز ہے اور جو چیز زائد ہوتی ہے وہ چھانٹ اور کاٹ دی جاتی ہے تو ڈاڑھی کو بھی کٹوا دینا چاہیے یہ اصولی بات ہے۔ حضرت تو بلا کے ذکی تھے فرمایا کہ آپ کا اصول ہمیں مسلم ہے، اب ہم آپ سے پوچھتے ہیں جب آپ پیدا ہوئے تھے اس وقت آپ کے یہ بتیس دانت بھی نہیں تھے پہلے اسے آپ اکھڑوایئے اس کے بعد مسئلہ پوچھئے، تو واقعی دنداں شکن جواب دیا لفظاً بھی دنداں شکن اور معناً بھی دنداں شکن۔

(ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲ ص۱۵۵، خزینہ، ص: ۲۶۳)

جیسے ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا حضرت آپ کی عمر کیا ہے؟ فرمایا پینسٹھ سال تو اس نے کہا کہ ڈاڑھی سے تو آپ بہت بڑے معلوم ہوتے ہیں، فرمایا کہ ہاں ڈاڑھی سے تو میں پندرہ سال بڑا ہوں وہ پچاس سال کی ہے اور میں پینسٹھ سال کا ہوں۔

(ملفوظاتِ فقیہ الامت قسط۴، ص: ۸۶)

ڈاڑھی منڈوانے کی ابتداء

اور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ قومِ لوط نے اس کی ابتداء کی (روح المعانی) کیونکہ وہ لواطت کی بیماری میں مبتلا تھے، اس لیے امرد رہنا پسند کرتے تھے تو ڈاڑھی کٹانا یہ آپ ﷺ کی صورت سے چوبیس گھنٹے مخالفت اور چوبیس گھنٹے کا یہ گناہ ہے۔ اور ہم تو کہتے ہیں کہ ڈاڑھی کٹوانے سے جمال میں اضافہ نہیں ہوتا اگر کوئی یہ اشکال کردے کہ جنت میں ڈاڑھی نہیں ہوگی، اور ظاہر ہے وہ جمال کی صورت ہے، اس لیے ہم اس سے تشابہ اختیار کر رہے ہیں تو ہم ان سے کہیں گے پھر آپ سو بیویاں بھی رکھئے اور آپ شراب بھی پیتے رہیے، ظاہر بات ہے یہ احمقانہ بات ہے، بات یہ ہے کہ ہر جگہ کے احکام الگ ہیں، یہاں تو آدمی شریعت کا مکلّف ہے اور وہاں وہ چیز جمال و تنعم کی وجہ سے ہے اور یہاں ہیبت مطلوب ہے، اسی لیے فقہا لکھتے ہیں اگر کسی عورت کی ڈاڑھی نکل آئے تو وہ کاٹ دی جائے گی، تو مرد کے لیے یہاں ہیبت مطلوب ہے۔ چنانچہ آپ تجربہ کریں کہ دس آدمی آپ ایسے کھڑے کردیں جن کی ڈاڑھیاں ہیں اور دس آدمی ایسے کھڑے کردیں جن کی ڈاڑھیاں نہیں ہیں، تو آپ بتائیے کہ ہیبت کس کی معلوم ہوگی، تو یہ ڈاڑھی والے جتنے احباب ہیں ان کی ایک خاص شان ہے۔

ساونت کے گیت ساونت میں اچھے لگتے ہیں

دوسری ایک بات یہ ہے کہ وہ ''ساونت کے گیت ساونت'' ہی میں اچھے لگتے ہیں، جو بچہ کہ ابھی امرد ہے جس کی ڈاڑھی نہیں ہے اس زمانے میں تو وہ شکل اچھی لگ رہی ہے، اور بڑے ہونے کے بعد طبعی فطری تقاضہ یہ ہے کہ اس کے چہرے پر بال ہو۔ چنانچہ جو لوگ ڈاڑھی کٹاتے ہیں ان کے چہرے پر وہ جمال کی کیفیت باقی نہیں رہتی۔

اور مجھ سے ایک صاحب نے کہا کہ شادی کرنا ہے، اس لیے ڈاڑھی نہیں رکھی ہے تو میں تقریر کے لیے جا رہا تھا میں نے اس سے کہا کہ یہ مجمع میں جتنے ڈاڑھی والے ہیں وہ سب غیر شادی شدہ نہیں ہے۔

میرا منشاء دل آزاری نہیں ہے

تو خیر! اگر توفیق نہیں ہوئی تو حق تعالیٰ سے توفیق مانگے، میرا منشاء دل آزاری دل خراشی نہیں ہے، لطیف عنوان سے تنبیہ ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس زمانے میں لوگ ننگے پھرنے میں جب حیا نہیں کرتے آپ دیکھیں کیسی کیسی فیشن نکلی ہے کہ عقل سر پیٹے، تو کیسے کیسے لباس، اس کے بالمقابل آپ انبیائے کرام علیہم السلام کا لباس اور ان کی تعلیم لباس کے معاملے میں دیکھیں کہ شہوت ابھرتی بھی ہو تو نہیں ابھرے گی۔ اور آپ نئی فیشن کو دیکھیں، مثال کے طور پر عورتوں کے جوتے اور سینڈل لے لیجیے کہ اس کا پچھلا حصہ ابھرا ہوا ہوتا ہے کہ آپ ذرا دھکا لگائے تو کہیں نالی میں گر جائے، اسی طرح لباس بھی آپ دیکھ لیجئے کیسے نکلے ہیں اور شریعت کی تعلیم آپ دیکھئے کہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے کی کہ شہوت ابھرتی ہو تو بھی نہ ابھرے، تو انبیائے کرام علیہم السلام مستقل ایک نہج لے کر آتے ہیں دنیا میں۔

ڈیوٹی اور وَردی دونوں مطلوب ہیں

بعض لوگ وہ بات کہہ دیتے ہیں جو سعدی نے کہی ہے کہ ”در عمل کوش و ہر چہ خواہی پوش“ (بوستاں) جو چاہے پہنو، مگر عمل میں کوشش کرو، مگر مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی بڑی اچھی مثال دیتے ہیں کہ دیکھو دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ ایک تو ہے پولیس کی ڈیوٹی اور ایک ہے وردی تو پولیس مین اگر جوب پر آجائے لنگی پہن کر تو گورنمنٹ اس کو فوراً ڈسمس کر

دے گی، حالانکہ اس نے صرف وردی کا لحاظ نہیں کیا ڈیوٹی پر تو وہ آ گیا ہے، اور ایک شکل یہ ہے کہ وردی پہن کر گھر میں بیٹھا رہا، جوب پر نہیں گیا تب بھی اس کی آ بنے گی، تو معلوم ہوا کہ دونوں چیزیں مطلوب ہے وردی بھی اور حاضری بھی، کیونکہ اس کا اثر پڑتا ہے۔
(مجالسِ ابرار، ص: ۵۳۵)

ایک گہری حقیقت

بلکہ اگر آپ زیادہ گہرائی میں جانا چاہیں تو آپ دیکھئے لباس کا اثر کیسا ہے؟ ایک کپڑا آپ کے سامنے آتا ہے تو آنکھیں تو اس کے رنگ سے لطف اندوز ہوتی ہے اور قوتِ لامسہ اس کے چھونے سے لطف اندوز ہوتی ہے اور قیمت اس کی معنوی چیز ہے، چاہے لکھی ہو حسی طور پر اس سے قلب لطف اندوز ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کپڑا بھڑکدار نہیں ہوتا مگر قیمتی ہوتا ہے، تو آدمی کو مسرت ہوتی ہے کہ بہت قیمتی ہے، جیسے انگلینڈ کوئی صاحب آئے انہوں نے اپنے دادا کے لیے کپڑا بھیجا بڑودا، وہ بہت قیمتی تھا، مگر وہ اس کو دیکھ کر گالی بکنے لگے کہ یہ کیا ٹاٹ جیسا بھیجا، تو چونکہ ان کو اس کی حقیقت کا ادراک نہیں تھا اس لیے ایسا ہوا۔ (فیضِ ابرار ج۶، ص: ۱۲۱)

تو قیمت سے بھی آدمی کے قلب کو مسرت ہوتی ہے۔ اب آپ ذرا اور غور کیجئے کہ آنکھ اور یہ چھونے کی قوت یہ اس بدن کا ظاہر ہے ﴿ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ اور قیمت اس بدن کا جو ہے ''عالم الغیب'' ہے تو آنکھیں اور جلد جو ہے وہ بھی کپڑے سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ '' عالم الشهادة '' پر اس کا اثر ہے اور قلب قیمت سے متمتع ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ غیب کے عالم پر اس کا اثر ہے، تو جب انسانی بدن کے غیب اور شہادت متأثر ہو رہے ہیں تو دنیا اور اس کے بعد آخرت پر بھلا کیسے اس کے اثرات نہیں پڑیں گے، اس لیے لازمی طور پر اس کے اثرات پڑیں گے، یہ میرے حکیم

الاسلام رحمہ اللہ نے ایک مقام پر لکھا ہے (التشبہ فی الاسلام) اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسی بات لکھی ہے کہ طبیعت جھوم جھوم جائے عش عش کر جائے، تو یہ تو گویا وہ کشکول سا ہوگیا۔

حصولِ شرحِ صدر کے لیے یہ چیزیں اختیار کریں

میں ذکر کر رہا تھا کہ شرحِ صدر بڑی چیز ہے، اللہ تعالیٰ وہ ہم سب کو نصیب فرمائیں، اور اس کے لیے صحبتِ صالحین، تقویٰ، دینی خدمت، محنت، یہ سب چیزیں اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت نصیب فرمائیں ہم لوگوں کو، اب دعا کیجئے۔

تمّت بالخیر